ایک کہانی

پبلشر کتب خانہ علم وادب، دھلی

ایک کہانی

چھ ادیبوں کی زبانی

آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ کی اجازت سے

کتب خانہ علم و ادب دہلی

بار دوم ۱۹۴۴ء ۸ر

تعارف

		صفحہ
پیش لفظ	جناب صادق الخیری ایم۔اے دہلوی	۳
پہلی قسط	جناب مولانا نیاز فتحپوری	۶
دوسری قسط	جناب سید علی عباس حسینی صاحب	۱۴
تیسری قسط	جناب ل۔احمد اکبر آبادی	۲۶
چوتھی قسط	جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم	۳۷
پانچویں قسط	جناب سید امتیاز علی صاحب تاج	۴۷
چھٹی قسط	جناب خان بہادر حکیم احمد شجاع	۶۰

پیش لفظ

غالباً ۱۹۳۷ء کی بات ہے ایک روز کالج سے واپسی پر مولوی شاہد احمد صاحب کا گرامی نامہ ملا جس میں ایک افسانہ کا پلاٹ اور یہ تحریر تھا کہ اس پلاٹ پر افسانہ لکھ کر بھیج دو۔ پھر ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس پلاٹ پر مختلف فسانہ نگاروں سے افسانے لکھوائے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اُس سال جو "ساقی" کا افسانہ نمبر شائع ہوا تو اس میں یہی جدت تھی کہ ایک پلاٹ پر مختلف حضرات نے اپنے اپنے رنگ میں افسانہ نگاری کا کمال دکھایا۔ اردو میں یہ ایک بالکل نئی چیز تھی جس کی پڑھنے والوں نے خوب داد دی۔ دوسرے سال "افسانہ نمبر" کے لئے ایک اور تجویز ذہن میں آئی، یعنی پلاٹ ایک ہی ہو مگر اس پر جو افسانہ لکھا جائے اس کی تکمیل میں کئی فسانہ نگار حصّہ لیں۔ افسوس ہے۔ یہ تجویز چند وجوہ کی بنا پر عملی جامہ نہ پہن سکی۔

یہ تجویز ابھی تک زیر غور تھی کہ معلوم ہوا لکھنؤ ریڈیو اس قسم کا ایک سلسلہ شروع کر رہا ہے جو مئی میں ختم بھی ہو گیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ریڈیو والوں نے پلاٹ خود ہی تجویز کر دیا تھا اور اُن حضرات کو جنہوں نے اس میں حصّہ لیا اس کی تکمیل کی دعوت دی۔ یا ہر شخص کو اختیار تھا کہ جس طرح چاہے پلاٹ بناتا چلا جائے۔ غالباً دوسری صورت ہوئی ہے۔ اسی لئے آخری قسط پہلی قسط سے صد درجہ اجنبی اور کہیں زیادہ دلچسپ و پُر لطف ہے۔

"چھ ادیب اور ایک کہانی" افسانوی ادب کا ایک نیا تحفہ ہے اور چونکہ اسے پیش ریڈیو والوں نے کیا ہے اس لئے اس جدت پسندی اور ہمارے افسانوی کے باب میں ایک اچھوتا اضافہ کرنے کا سہرا اُن ہی کے سر ہے۔

چھ ادیب اور ایک کہانی" ایک طویل افسانہ ہے جسے مکمل کرنیوالے مشہود ادیب اور معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی قسط اس کی افسانہ نگاری کا بہترین نمونہ ہے اور آپ اسے پڑھ کر آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ افسانہ نگار اس فن میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ جب آپ اس افسانے کو ایک نشست میں پڑھیں گے تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ نیاز کی ابتدا کو علی عباس حسینی نے کیسی عمدگی سے نبھایا اور ل۔ احمد نے اسے بڑھا کر پلاٹ کو کیسی عجیب کروٹ دی ہے۔ پھر آپ ملاحظہ کریں گے کہ یلدرم ریحانہ کو آہستہ آہستہ اس سطح پر لے آتے ہیں جب وہ اپنی نسوانی فطرت کو ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہے۔

پانچویں قسط میں ایک نئی چیز ملے گی۔ نیاز۔ حسینی۔ ل۔ احمد۔ اور یلدرم جو کچھ کہہ چکے ہیں۔ تاج اسے طرح طرح سے یاد دلا کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر میں ٹیپ کا بند حکیم احمد شجاع نے ترتیب دیا ہے۔ جسے پڑھ کر آپ کبھی ہنسیں گے اور کبھی چونکیں گے۔ مرزا سعید بیگ صاحب کی جو وضع قطع اور کم علمی و حماقت آپ نے آغاز میں دیکھی تھی، یہاں وہ اپنی منتہا پر پہنچتی ہے اور ناممکن ہے کہ موقع پر آپ بغیر ہنسے رہ سکیں لیکن فوراً ہی مصنّف ضلع کا مسئلہ اُٹھاتا ہے اور کچھ ایسے سلیقہ سے کہ طبیعت تفکر پر آمادہ ہوتی ہے۔ افسانہ کو ختم کرنے اور ہیروئن کو مشکلات سے نجات دلا کر مناسب نتیجہ نکالنے کی یہی ایک صورت تھی اور وہ اس میں کامیاب

ہوئے ہیں۔

اُردو کا مشہور دارالاشاعت 'کتب خانہ علم و ادب دہلی ہمیشہ شائقین ادب کے لئے نئی اور عمدہ چیزوں کی تلاش میں رہتا ہے" ساقی" کے ایک پلاٹ پر مختلف افسانوں کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے بعد یہ اسی ادارہ کا حق تھا کہ "چھ ادیبوں اور ایک کہانی" بھی شائع کرے۔ چنانچہ اس کے مہتمم سید وصی اشرف صاحب حصول اجازت کے بعد اسے پیش کرتے ہیں۔

میرے خیال میں وہ ہمت افزائی کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے ان "ہوائی بادلوں" کو جو اجزائے ہستی کی طرح عناصر قدرت میں جا ملے تھے پھر سے "زندگی" بخشی، ایسی زندگی جو اُردو ادب میں افسانے کی ان کڑیوں کے دوام کا باعث ہونگی۔

۲۵ر اگست سنہ ۱۹۳۹ء

صادق الخیری۔ دہلی

پہلی قِسط

(از مولانا نیاز فتحپوری)

مرزا اسد علی بیگ کی کوٹھی میں جہاں ہر وقت غیر معمولی چہل پہل رہتی تھی اس وقت سنّاٹا ہے ایک سہما ہوا سنّاٹا۔ لوگ اِدھر اُدھر چل پھر رہے ہیں۔ لیکن بالکل دبے پاؤں۔ نوکر چاکر باتیں کر رہے ہیں۔ مگر نہایت آہستہ آہستہ مرزا جی کے بعض دوست باہر مردان خانے میں بیٹھے ہوئے ہیں لیکن خاموش اور افسردہ، دفعتاً ایک انگریز ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ لئے ہوئے زنان خانے کی ڈیوڑھی سے باہر نکلتا ہے اور سب لوگ اُس کی صورت دیکھنے لگتے ہیں۔ کوئی گھبرا کر کُرسی سے اُٹھ بیٹھتا ہے۔ کوئی بیتاب ہو کر اُس کی طرف چل پڑتا ہے اور کوئی اپنی جگہ کسمسا کر رہ جاتا ہے لیکن بولتا کوئی نہیں۔ اُس کا چہرہ بھی اُترا ہوا ہے اور اُس کی موٹی موٹی بھوؤں کی شکنیں بتا رہی ہیں کہ وہ کوئی اچھی خبر سُنانے کے لئے آمادہ نہیں۔ مرزا اسد علی بیگ دارانگر کے رئیس قصبہ کے اُن چند معززین میں سے تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگی ایک وضع ایک ادا ایک شان سے بسر کر دی اپنے اخلاق کے لحاظ سے وہ ان لوگوں کی یادگار تھے جو انسانی ہمدردی کے مقابلہ میں تمام ذاتی اغراض کو بُھلا دیتے ہیں اور دوسروں کے لئے تکلیف اُٹھانے میں خاص لذّت اور مسرّت محسوس کرتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ جس وقت لوگوں کو ان کی بیماری کا حال معلوم ہوا تو سارے قصبہ میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی اور ہر شخص فکرمند نظر آنے لگا۔ رات کو حسب معمول نو بجے تک دیوان خانے میں بیٹھے رہے وہیں احباب کے ساتھ کھانا کھایا باتیں کرتے رہے

لیکن جب آرام کرنے کے لئے اندر جانے لگے تو دفعتاً پاؤں لڑکھڑائے اور بیہوش ہو کر گر پڑے۔ ان کے ایک دوست نے جو قصبہ کے مشہور طبیبوں میں تھے دیکھا اور فالج کا اثر تجویز کیا۔ اسیوقت موٹر ایک آدمی الہ آباد بھیجا گیا تاکہ راتوں رات سول سرجن کو اپنے ساتھ لے آئے۔

اس وقت زنان خانے سے باہر جو انگریز نکلا وہ یہی سول سرجن تھا جس کو دیکھ کر ہر شخص ہمہ تن سوال بن گیا تھا اور جب اس نے یہ ظاہر کیا کہ فالج کا حملہ براہ راست قلب پر ہوا ہے اور زندگی کی کوئی امید نہیں ہے تو ہر شخص کا کلیجہ دھک سے کر کے رہ گیا۔

مرزا جی خاندانی رئیس تھے لیکن اُن امیروں کی طرح نہ تھے جو اپنی ساری عمر اس کوشش میں صرف کر دیتے ہیں کہ باپ دادا کی دولت کو کیونکر ضائع کیا جائے اُنہوں نے نہایت فراخ دلی سے خاندان کے ہر شخص کی خدمت کی اور اپنے اور اپنے عزیزوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر ہمیشہ بیدریغ روپیہ صرف کیا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے ان سے کوئی مدد طلب کی ہو اور اُنہوں نے انکار کر دیا ہو۔

ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور اب ان کے صرف ایک ہی لڑکا تھا جس کا نام سعید بیگ تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی تعلیم اور تربیت کیلئے اُنھوں نے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ کچھ نہ نکلا۔ مرزا جی ہر چند پرانی وضع کے بزرگ تھے اور قدیم خاندانی روایات کا احترام کرتے تھے لیکن وہ جدید تعلیم کو بھی ضروری سمجھتے تھے، اور ترقی کی نئی راہوں کا ہمیشہ بہت غور سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے پہلے اپنے بیٹے کو فارسی کی وہی قدیم تعلیم دلوائی جو شریف خاندانوں میں رائج تھی۔ لیکن ما مقیماں اور دستور الصبیان

سے آگے اُن کے ذہن نے یاوری نہ دی اس کے بعد مرزا جی نے انگریزی تعلیم کا انتظام کیا۔ لیکن مرزا جی کی انتہائی کوشش کے باوجود وہ تیسری جماعت کی ریڈر سے زیادہ نہ پڑھ سکے ان کا فطری میلان کچھ نہ کرنا تھا اور یہی کر کے اُنھوں نے دکھلایا۔ انھیں ایسے لوگوں کی صحبت زیادہ پسند تھی جو وہم پرستی میں مبتلا تھے اور اسی قسم کے واقعات بیان کیا کرتے تھے ان کو بہ نسبت شہر کے جنگل اور بہ نسبت آدمیوں کے جانوروں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ان کا وقت زیادہ تر ویران خانقاہوں اور شکستہ مقبروں میں بسر ہوتا تھا ان کے جاہل دوستوں نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ وہ پیدا ہی قابل ہوئے ہیں انھیں پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت ہے اور مرزا جی آخر سعید سے اسی لئے بہت ناخوش ہو گئے تھے اور اُنھوں نے اپنی جائداد میں بھی کوئی ایسا تغیر کر دیا تھا جس کا علم ان کے سوا شاید کسی کو نہ تھا۔

مرزا جی کی وضع تو وہی پرانے لوگوں کی سی تھی۔ چڑھی ہوئی ڈاڑھی بل کھائی ہوئی مونچھ، ٹیڑھا صافہ چُست انگرکھا، ڈھیلا پائجامہ، لیکن سعید کی صورت و وضع ان کے پندار و لیاقت کے لحاظ سے کچھ اور تھی۔ لانبی ڈاڑھی، لانبی عبا، کھرل نما صافہ اور دیسی جوتہ اس قسم کا فرق کچھ باپ بیٹے کے اخلاق میں بھی تھا۔ جسے لوگ محسوس تو کرتے تھے مگر ظاہر نہ کرتے تھے۔ مرزا جی کی ایک بہن بھی تھیں جو کسی غریب گھرانے میں بیاہی تھیں لیکن بعد کو جب وہ بیوہ ہو گئیں تو انھوں نے مع اپنی اکلوتی لڑکی ریحانہ کے اپنے ہی پاس بُلا لیا مرزا جی نے بہت کوشش کی کہ وہ جائداد میں سے بہن کا حصّہ الگ کر کے ان کے حوالہ کر دیں لیکن وہ نہ مانی اور اس کی تلافی مرزا جی نے اس طرح کر دی کہ کمسنی ہی میں ریحانہ اور سعید کی شادی کر دی۔ مرزا جی نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ ریحانہ کی تعلیم کا بھی پورا انتظام کیا اور چونکہ

سعید کچھ نہ پڑھا تھا اس لئے اُنھوں نے چاہا کہ ریحانہ سب کچھ پڑھ لے۔ چنانچہ مشرقی علوم کے ساتھ انگریزی کی بھی تکمیل اُس نے کی اس وقت تک رُخصتی کی رسم عمل میں نہ آئی تھی۔ کیونکہ مرزاجی کا خیال تھا کہ پہلے ریحانہ کی تعلیم کا پورا ہو جانا ضروری ہے لیکن قدرت کا انتظام بھی کس قدر عجیب ہے کہ مرزاجی کی یہ آرزو اور زندگی دونوں ساتھ ساتھ پوری ہوئیں۔

ریحانہ سعید کی پھوپی زاد بہن ہی تھی۔ غیر تو تھی نہیں کہ پردہ کرتی۔ لیکن چونکہ مرزاجی خاص اصول کے انسان تھے اور اُنھوں نے ابتدا ہی سے اس کا انتظام کیا تھا کہ ریحانہ اپنی ماں کے ساتھ علیحدہ مکان میں رہے اس لئے سعیدؔ ریحانہ کو اس وقت تک ایک دوسرے کو دیکھ لینے کے موقع بھی کم ملتے تھے۔ چہ جائیکہ تبادلۂ خیال کہ اس کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔

ریحانہ کی عمر اس وقت ۲۰ سال کی تھی اور سعید کی چوبیںؔ سال۔ شکل وصورت کے لحاظ سے دونوں بُرے نہ تھے قریب قریب ایک سے تھے۔ لیکن مزاج کے لحاظ سے دونوں میں بڑا اختلاف تھا۔ سعید نہایت وہمی سے انسان تھے اور ہر چیز کا مطالعہ وہ حد درجہ پست ذہنیت اور انتہائی مایوسانہ انداز سے کیا کرتے تھے۔ وہ امیر باپ کے بیٹے تھے جو راحت و آسائش چاہتے حاصل کر سکتے تھے لیکن لوگوں نے انھیں سمجھا دیا تھا کہ جس قدر بدتمیزی کے ساتھ وہ سادہ زندگی بسر کرینگے اُتنی ہی زیادہ اُن کی مقبولیّت میں اضافہ ہوگا اور دُنیوی اسباب تہذیب و تمدّن سے وہ جس قدر الگ رہیں گے اُتنا ہی زیادہ وہ دین سے قریب ہوتے جائیں گے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی صورت و وضع کو اس قدر ڈراؤنا بنا لیا تھا کہ دُور ہی سے دیکھکر لوگوں پر ہیبت چھا جاتی تھی اور سیرت کے لحاظ سے ان کی حالت بالکل ایک

ایسی خشک لکڑی کی سی تھی جس کے جھکانے میں ہر وقت اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ پھر اگر یہ سب کچھ فطری سادگی کے ساتھ ہوتا تو بھی چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ان تمام باتوں کی نمائش بھی زیادہ کرتے تھے۔ اور اس بُری طرح گویا ان کا پہنچا ہوا ہونا کوئی مرض متعدّی ہے۔ جس سے دوسروں کو ضرور متاثر ہونا چاہیئے۔ وہ جس وقت گھر سے باہر نکلتے تو آئینہ میں دیکھ لیتے کہ ان کے بال کافی اُلجھے ہوئے ہیں یا نہیں۔ صافہ کے پیچ میں استغنائے کامل ظاہر کرنے والی بدترتیبی پائی جاتی ہے یا نہیں۔ وہ اس کو بھی پسند نہ کرتے کہ ان کا جوتہ جو کچے چمڑے کا ہونے کی وجہ سے زیادہ خاک آلودہ ہو جاتا تھا صاف رکھا جائے۔

ریحانہ کی پرورش بھی ہر چند اسی خاندان میں ہوئی تھی جس میں سعید کی لیکن نئی تعلیم نے اس کے ذوق کو ان سے بالکل مختلف کر دیا تھا وہ یقیناً عام تعلیم یافتہ عورتوں کیطرح بیباک اور آزاد نہ تھی۔ لیکن یہ ضرور سمجھتی تھی کہ دُنیا میں عورت بھی اپنی ہستی مرد سے علیحدہ رکھتی ہے اور وہ صرف مرد کے سہارے اندھوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوئی۔ وہ مذہب کا بھی کافی احترام دل میں رکھتی تھی وہ قدیم خاندانی روایات کی بھی عزت کرتی تھی بڑوں کی اطاعت و فرمانبرداری بھی اپنا فرض سمجھتی تھی۔ لیکن اطاعت و نازمائی کے درمیان جو خط فاصل اس نے کھینچ رکھا تھا اس کا تعلق بڑی حد تک ذاتی خودداری اور رائے و ضمیر کی آزادی پر منحصر تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ انسان دُنیا میں بدتمیزی پھیلانے اور بدتمیزی کی زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا اور اس کا فرض ہے کہ زمانہ کا ساتھ دے اور تمام ممکن ذہنی ترقیوں سے فائدہ اُٹھائے۔

اس کی وضع وقطع میں نئی تعلیم نے کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔

لیکن وہ اس مسئلہ کو بھی اس نقطۂ نظر سے دیکھتی تھی کہ اگر خوش وضعی انسان کے اخلاق پر کوئی بُرا اثر نہیں ڈالتی تو وہ یقیناً اچھی چیز ہے۔ پردہ کا مفہوم اس کی نگاہ میں صرف نسائی خودداری تھا۔ وہ گھونگھٹ نقاب جھلملی، چلمن، اوٹ اور گھر کی اونچی اونچی دیواروں کی زیادہ قائل نہ تھی کیونکہ اس کے نزدیک یہ تمام باتیں عورت کے اعتماد کو چھین لینے والی ہیں، اور ان کی وجہ سے اس کو کبھی یہ سمجھنے کا موقع نہیں ملتا کہ ان چیزوں سے علیحدہ ہو کر وہ کیا ہے، اور دُنیا میں اپنی وقعت دوسروں سے تسلیم کرانے کے لئے اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ وہ تو پسند نہ کرتی تھی کہ عورت بے پردہ ہو کر سوسائٹی کی عام ملکیت بن جائے۔ لیکن پردہ کے اندر رہ کر وہ نسوانی عفت کو عورت کے لئے کوئی حصّہ امتیاز بھی نہ سمجھتی تھی۔

تعلیم کے دوران میں بارہا یہ بات اُس کے کانوں میں پڑی کہ سعید پسند نہیں کرتے کہ وہ اپنی تعلیم کو جاری رکھے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے باپ سے کئی بار دبی زبان سے شکایت بھی کی۔ لیکن مرزا جی ایک فیصلہ کر چکے تھے اور وہ ان لوگوں میں نہ تھے جو کوئی فیصلہ کرنے کے بعد اس سے ہٹ جائیں خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے ریحانہ کی تعلیم برابر جاری رہی اور اس طرح میاں بیوی کے درمیان ایک قسم کی اجنبیت پیدا ہوتی رہی۔ گو عملی زندگی میں اُس کے تجربہ کا موقع اس وقت تک نہ ملا تھا۔

(۲)

مرزا جی کے انتقال کو دو مہینہ کا زمانہ گذر گیا اور تمام جائیداد کا انتظام سعید کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ ریحانہ بدستور اپنی ماں کے ساتھ علیحدہ مکان میں

رہتی ہے اور چونکہ سعید کی طرف سے رخصتی کی کوئی تحریک نہیں ہوئی تھی اسلئے وہ بھی خاموش تھی۔ تاہم اتنا ضرور جانتی تھی کہ ایک نہ ایک دن یہ وقت آئے گا اور ہو سکتا ہے کہ اس وقت جو شرائط پیش کی جائیں وہ اُس کے لئے قابلِ قبول نہ ہوں۔۔ ایک دن صبح کو سعید کی ایک تحریر ریحانہ کی والدہ کے پاس آئی۔ جس میں لکھا تھا کہ والد مرحوم کے انتقال کے بعد جائیداد کے جھگڑوں میں پھنسا رہا اور مجھے حاضری کا موقع نہ ملا۔ میرے آپ کے درمیان علاوہ پھوپی اور بھتیجہ ہونے کے جو دوسرا تعلق قائم ہو چکا ہے اس کی بابت میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن آپ سے نہیں آپ کی صاحبزادی سے اس لئے میں اس گفتگو کے لئے آج سہ پہر کو حاضر ہوں گا۔

ریحانہ کی ماں تو منتظر ہی تھیں اُنھوں نے کہلا بھیجا کہ تمہارا گھر ہے جس وقت چاہو آجاؤ اور وہ خط ریحانہ کو دے دیا ریحانہ یہ تحریر لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور سوچنے لگی کہ وہ کیا گفتگو کریں گے اور اسے کیا جواب دینا چاہیئے۔ اس نے سعید کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر جس کا کافی علم اسے ہو چکا تھا خود ہی ان تمام اعتراضات پر غور کیا جو ان کی طرف سے کئے جا سکتے تھے اور خود ہی اُن کے جوابات سوچے یہاں تک کہ سارا دن اسی اُدھیڑ بن میں گذر گیا اور آخر کار وہ ساعت آگئی جس میں اس کی زندگی کا بالکل نیا ورق اُٹھا جانے والا تھا۔ ریحانہ خوب صورت تو نہ تھی لیکن دلکش بہت تھی۔ صرف اعضا کا تناسب اور نک سک سے درست ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ دل پر جو چیز اثر ڈالتی ہے وہ صرف انسان کی خوش ادائی ہے اور اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنی سادہ مگر حقیقی معنی میں نہایت پُرکار اداؤں کے لحاظ سے بہت غیر معمولی چیز تھی اس نے سوچا کہ سعید کے سامنے آج اس وضع و لباس اس زیبائش و آرائش اور عشوہ و ادا کے اس اہتمام

کے ساتھ آنا چاہیئے کہ جوان کے لئے حد درجہ قابل برداشت ہوتا کہ اس تعلق کا انتہائی تاریک پہلو اس کے سامنے ایک بار آجائے اور اُسے اپنی آئندہ زندگی کی راہیں متعین کرنے میں آسانی ہو جائے۔ چنانچہ اس نے باریک آسمانی رنگ کی ریشمی ساری پہنی جس سے اس کا جسم جھلکتا تھا اور جس کے حاشیہ کی بیل مختلف پرندوں کی شکلوں سے بنائی گئی تھی۔ وہ یوں تو روز سیدھی مانگ نکالتی تھی لیکن آج اُس نے ٹیڑھی مانگ نکالی۔ اور داہنی طرف پیشانی پر اپنے بالوں میں گھونگر پیدا کرکے اُنھیں اس قدر جھکا لیا کہ نصف پیشانی ان سے چھپ گئی۔ چہرے پر پاؤڈر بھی لگایا، ناخن، لب و رخسار پر سرخی بھی ملی اور باریک ریشمی موزوں پر جوتا بھی وہ پہنا جس میں سوائے دو چار تسموں کے کوئی چیز پاؤں کی جلد کے رنگ کو چھپانے والی نہ تھی۔

الغرض سعید کے لئے وہ ہمہ تن جنت کا وہ درخت بن کر رہ گئی جسکے چھونے کی آدم کو ممانعت کی گئی تھی۔ جس وقت اُسے اطلاع ملی کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں۔ اُس نے گراموفون پر ایک انگریزی ریکارڈ چڑھا دیا۔ اور ہاتھ میں ایک انگریزی ناول لے کر بیٹھ گئی۔ دروازے پر کسی نے دستک دی اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے قصداً دیر کی تاکہ آنے والے کو معلوم ہو جائے کہ گراموفون پر جو ریکارڈ چڑھا تھا وہ انگریزی گانے کا تھا۔ جب سعید کئی بار دروازہ کھٹکھٹا چکے تو ریحانہ نے گراموفون بند کر دیا۔ میز پر کتاب پلٹ کر رکھ دی اور دروازہ کھول کر ایک ایسی آواز سے جس میں انتہائی تکلف کے ساتھ نرمی اور شیرینی پیدا کی جاتی ہے سعید کو اندر تشریف لانے کی دعوت دی۔ سعید ریحانہ کے اس مختصر لیکن حد درجہ پُرتکلف

کمرے میں جہاں میزوں، کرسیوں، ریشمی پردوں، گلدانوں اور تصویروں کے سوا کچھ نہ تھا، داخل ہوئے۔ لیکن بالکل اس طرح جیسے چور چوری کرنے جاتا ہے۔ دروازہ کے اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلا صدمہ تو یہ پہنچا کہ کمرے کی ساری فضا انگریزی عطریات سے بسی ہوئی تھی ایران کا شامہ جو صرف لوبان کے دھوئیں کا عادی تھا اس قدر بے چین ہو کر بے اختیار رہوا کہ رومال ناک تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد ان کی نگاہوں نے ایک سرسری جائزہ دوسری چیزوں کا بھی لیا اور وہ کچھ ایسا محسوس کرنے لگے کہ ان کا دم گھٹتا جا رہا ہے اور وہ کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

بجائے اس کے کہ ریحانہ ان سے حجاب کرتی خود ان کا جی یہ چاہتا تھا کہ شرما کر منہ چھپا لیں۔ یقیناً وہ دل میں بہت برہم ہوئے لیکن ساتھ ہی ساتھ مرعوب بھی اتنے تھے کہ ان کی برہمی حیرت میں تبدیل ہو گئی تھی اور وہ سوچ رہے تھے کہ آنے کو تو میں آگیا ہوں لیکن ایسا نہ ہو کہ کوئی مجھے یہاں سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ لے۔ اُنھوں نے دروازہ کے اندر آتے ہی دیکھا کہ فرش پر ریشمی قالین بچھا ہوا ہے۔ اس لئے پا انداز ہی پر جوتہ اُتار دینا چاہا لیکن جس وقت یہ آواز کانوں میں آئی کہ یوں ہی تشریف لے آیئے تو وہ چونکے اور آگے بڑھے لیکن بالکل بے اختیارانہ اور بڑھ کر نرم کمانی کی گدے دار کرسی پر بیٹھ گئے۔ لیکن اس طرح گویا ان کے مقصد و ارادہ کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ ریحانہ سامنے گردن جھکائے بیٹھی تھی لیکن کنکھیوں سے وہ ان کی حرکتوں کو بھی دیکھتی جاتی تھی۔

سعید یہ تو جانتے تھے کہ ریحانہ نئی تعلیم اور نئے زمانہ کی عورت ہے لیکن یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اس کا گھر بُت خانہ ہے، اور وہ خود ایک بُت ہے۔ جس پر نگاہ ڈالنا بھی گناہ سے خالی نہیں فقط۔

دوسری قسط

(از سیّد علی عباس حسینی)

(۳)

ریحانہ بظاہر تو سعید کی گھبراہٹ سے لُطف لے رہی تھی اس لئے کہ اس کے عنابی لبوں پر مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لیکن خود اس کا دل بھی بلیوں اُچھل رہا تھا سعید اس کے کمرے میں آج پہلے پہل شوہر کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ ریحانہ کو معلوم تھا کہ ہمارے اس آریہ دیس میں بیوی کا درجہ باندی سے کچھ ہی بہتر ہے۔ بیاہ کے وقت لڑکی والے دُولھا سے چاہے لاکھ بار کہلا لیں کہ بیوی میں تیرا غلام ہوں، لیکن دولھا دل ہی دل میں یہ ضرور کتنا رہتا ہے کہ بیوی آج سے تو میری لونڈی۔ چنانچہ یہی ڈر تھا۔ جس کی وجہ سے ریحانہ کا دل دھڑک رہا تھا مگر عورت تھی پڑھی لکھی سمجھدار اور سعید کے معاملہ میں تجربہ کار بھی اس لئے اُس نے اس ڈر کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ بلکہ چہرہ سے یہی معلوم ہوتا رہا کہ وہ ان کی ہر بات پر ہنس رہی ہے اور ان کا مذاق اُڑا رہی ہے۔

سعید بھی ریحانہ کی اس مُسکراہٹ سے اچھی طرح واقف تھے۔ عمر میں بیسیوں مرتبہ اُنھیں اس مسکراہٹ کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اور ہر مرتبہ شکست کھانا پڑی تھی وہ جانتے تھے کہ وہ اس قسم کی مسکراہٹ ہے جو چوہیا کو پنجے کے نیچے دیکھکر بلّی کے چہرہ پر پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے ان کے یہاں گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ ایک سراسیمگی سی بھی پیدا ہو گئی تھی۔

سمجھتے تھے کہ ان کے خط کے بعد ریحانہ سہمی ڈری ہوئی گھبرائی گھبرائی سی دکھائی دے گی لیکن یہاں ریحانہ کے چہرے سے بجائے گھبراہٹ کے اطمینان ظاہر ہوا۔ بجائے خجالت کے خود اعتمادی دکھائی دی اور بجائے ڈر کے طنز کے آثار نمایاں ہوئے۔ جنگ میں مقابل کی ہراسانی ڈرپوک طبیعتوں کو بہادر بنا دیتی ہے۔ اور مقابل کا اطمینان دلاوروں کے دل میں بھی ڈر پیدا کر دیتا ہے۔ یہی حالت سعید کی بھی تھی۔

ریحانہ کی طنز بھری مسکراہٹ اور شرارت سے چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر وہ اس قدر مرعوب ہوئے کہ اُنھوں نے اپنی آنکھیں جلدی سے نیچی ہی نہ کر لیں بلکہ اپنے پاؤں پر جما لیں۔ اُن میں وہی کچے چمڑے والا گرد سے اَٹا ہوا پرانا جوتہ تھا اور یہ خوش وضع اور قیمتی پاپوش رکھی تھی ایک نفیس نئے ریشمی قالین پر۔ یہ امر اس قدر بے محل بے جوڑ اور بے جا تھا کہ سعید کو خود بخود ایک بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ اُنھوں نے پہلے تو ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھ کر جوتوں کی گندگی چھپانا چاہی۔ پھر وہ ریحانہ کی طرف کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کر جوتوں کو آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے رگڑنے لگے۔ کوشش یہ تھی کہ تھوڑی بہت گرد اسی طرح گر گر کر کم ہو جائے مگر اس حرکت سے فرش کی کیا گت بنے گی۔ اس کا خیال نہ تھا۔ ریحانہ کے دل میں ڈر نے اُسے اس فیصلہ پر پہونچنے پر مجبور کیا کہ مفر اور سلامتی، بیباکی اور نڈرہی میں ہے اور اس کی سب سے بہتر صورت یہی ہے کہ سعید کو اس وقت سنجیدگی سے بات چیت کرنے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ اس نے اسی لئے ان کی گھبراہٹ سے فائدہ اُٹھایا اور ایک ہلکی سی مُسکراہٹ سے کہا۔ "جوتہ کی خاک آپ جھاڑنا چاہتے ہیں تو میں کوئی ڈسٹر لا دوں"؟

سعید کی وہی حالت ہوئی جو اس چور کی ہوتی ہے جو چوری کرتے پکڑ لیا

جائے۔ پہلے تو گھبرا کر بول اُٹھے۔ "ہاں" پھر سنبھل کر بولے "نہیں نہیں"۔ ریحانہ نے گویا اس جواب کا آخری حصّہ سُنا ہی نہیں۔ وہ ایک ادائے خاص سے اُٹھی اور اوٹ کے پیچھے کمرے کا فرنیچر جھاڑنے کے جو ڈسٹر میز کی دراز میں دُھلا ہوا رکھا تھا نکال لائی۔ اس آنے جانے میں مشکل سے آدھا منٹ لگا ہوگا لیکن سعید نے اتنی دیر میں کئی بار پہلو بدلے اور پاجامے کے پائنچوں سے بہت حد تک ڈسٹر کا کام لیا۔ ریحانہ کو جو اُنھوں نے واقعی ڈسٹر ہاتھ میں لئے پلٹتے دیکھا تو پسینہ پسینہ ہو گئے۔ کندھے پر پڑے ہوئے میلے رومال سے مُنہ پونچھ کر بولے "ارے یہ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ م۔ مو۔ مجھے تو اس کی کوئی حاجت نہیں"۔

ریحانہ نے اُن کے جوتوں کی طرف نظر کی۔ اُنھیں پائنچوں نے بہت کچھ صاف کر دیا تھا۔ پھر وہ ایک ہلکی ہنسی کے ساتھ سعید کے رومال کی طرف اشارہ کر کے بولی "کیا آپ ایک ہی رومال سے جوتے اور مُنہ دونوں صاف کر لیتے ہیں"؟

سعید نے سمجھا شاید مُنہ میں مٹی بھر گئی۔ اُنھوں نے گھبرا کر ہاتھوں سے چہرہ پونچھا ہتھیلی اور اُنگلیوں کو دیکھا اُن میں سوائے پسینہ کی تری کے کوئی چیز نہ دکھائی دی۔ بوکھلا کے سادگی سے بولے "کچھ تو نہیں لگا ہے"۔ ریحانہ نے ہنس کر کہا "یہ میں نے کب کہا کہ آپ کے مُنہ میں کچھ لگا ہے۔ میں نے تو آپ کے ہاتھ میں رومال اور میلے جوتوں کو صاف دیکھ کر آپ سے یہ پوچھا کہ کہیں آپ جوتے اور چہرہ ایک ہی رومال سے تو صاف نہیں کرتے!"

سعید کی بوکھلاہٹ حد سے تجاوز کر گئی۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سوال کا جواب کیونکر دیں۔ انکار کرنے میں ڈر تھا کہ پائنچوں کا ذکر ضرور کرنا پڑے گا۔ اُنھوں نے پائنچوں کی گندگی چھپانے کے لئے ٹانگیں ایک دوسرے میں اُلجھا لیں پھر جلدی سے بولے۔ "نہیں تو ہاں ہاں!" ریحانہ کے موتی سے دانت

پھر جھلکے۔ اُس نے کہا کہ "یہ نہیں نہیں اور ہاں ہاں کے معنی بھی آپ ہی سمجھ سکتے ہیں"!

سعید جلدی سے اُٹھ کر کھڑے ہونے لگے۔ اُلجھی ہوئی ٹانگوں کا خیال نہ رہا گرتے گرتے سنبھلے۔ ریحانہ ہنس دی۔ آدمی کی صورت سے گھبرانے والے، ویرانوں، خانقاہوں اور ٹوٹے کھنڈروں میں یکسوئی قلب پانے والے سعید آج پہلے پہل ایک مرتبع کمرے میں ریحانہ کی سی جوان تعلیم یافتہ اور چنچل خاتون سے ملنے آئے تھے۔ عادی تو اس کے تھے کہ ہر بات صحیح اور درست سمجھی جائے اور ہر فعل بیجے ہونے کا ثبوت گنا جائے۔ مگر ریحانہ کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان نے بولنے ہی نہ دیا یہ آئے تھے رعب جمانے، حکومت جتانے۔ ڈانٹنے اور نصیحت کرنے لیکن یہاں اُلٹی آنتیں گلے پڑیں۔ کمرہ کیا تھا نگار خانہ۔ عورت کیا تھی بِس سے بھری ناگن۔ باتیں کیا تھیں بجلیاں گر رہی تھیں۔ آدمی اپنے حواس میں ہو تو ارادوں پر عمل بھی کیجیے لیکن جب حواس ہی بجا نہ ہوں تو بھلا نصیحتیں کیا خاک سوجھیں۔

سعید نے محسوس کیا کہ کمرے کی زہریلی فضا اُن کے دل و دماغ پر اثر کرتی جا رہی ہے۔ جن چیزوں سے وہ عمر بھر بھاگے اور بچے۔ جن چیزوں کو اُنھوں نے ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا وہ اُن کو آج معمول بنا رہی تھیں اُن کا اثر اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ سعید نے آج خود بخود اپنے جوتوں کی گندگی محسوس کی تھی، اور ریحانہ کی آنکھ بچا کر اپنے پائچوں ہی سے سہی مگر انھیں پونچھ ڈالا تھا۔ شرمندگی، خجالت، جھینپ، غصہ، جھلاہٹ، دھڑکا، وسوسہ، ڈر، نفرت، حقارت، غرض مختلف طرح کے اور مختلف درجے کے جذبات مل جل کر ایک تلاطم ایک ہیجان ایک طوفان برپا کئے ہوئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ ریحانہ سے باتوں میں جیتنے کی امید نہ تھی۔ اُس کی تیز زبانی کا کافی تجربہ تھا۔ وہ لفظ کی گرفت کرتی تھی ہر حرکت پر بناتی اور ہر فعل پر جملے کستی تھی۔ اس سے

کون زبان لڑائے کس میں اتنی یارائی اور کس میں اتنی گویائی تھی۔ سمجھے تھے کہ شاید اب بیوی بن کر اور ان کو اپنا مالک و مختار سمجھ کر دب جائے گی۔ مگر اس نے پھر وُہی پچھلی حرکتیں شروع کر دیں۔ جن سے عاجز آکر سعید ہمیشہ بھاگ جایا کرتے تھے اور مہینوں پھوپی سے ملنے تک نہ آتے تھے۔ آج بھی اُنھیں سلامتی بھاگنے ہی میں دکھائی دی۔ اس لئے اُٹھتے تھے کہ ریحانہ نے فاتحانہ انداز سے مُسکرا کر پوچھا۔

"کیوں کیا تشریف لے جائیے گا؟"

سعید نے کہا "ہاں" اور کمرے سے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے وہ چمک کر بولی: "ہیں اب کے صرف اکیلے "ہاں" کے استعمال کو کافی سمجھا اس کے جوڑے "نہیں" کو بھول گئے؟"

مرزا سعید پلٹ پڑے۔ ان کا منھ دوبارہ کھلا اور بند ہو گیا۔ ریحانہ اس بے بسی اس ہیئت کذائی پر ہنس دی۔ اس ہنسی نے تازیانہ کا کام کیا۔ بس وہ سرپٹ بھاگے۔ اس طرح جس طرح تیا بھڑ کا ہوا عرب جانور اتنا تیز جتنا کہ کمان سے چھوٹا ہوا تیر اور اتنا بد حواس جتنا میدان جنگ سے شکست کھایا ہوا لٹیرا۔

(۴)

کمرے سے باہر نکلتے ہی سعید کی چوٹ کھائی ہوئی خود بینی نے اپنا کام شروع کر دیا اور اُن کا غصہ انتہائی حد تک پہنچ گیا وہ اگر یونہی جلے بھنے گھر تک پہونچ جاتے تو کسی نہ کسی نوکر چاکر ماما دائی کی ضرور شامت آجاتی۔ لیکن اتفاق سے صحن میں پھوپی کا سامنا ہو گیا وہ اُن کی چائے اور ناشتہ کے اہتمام میں اپنے دالان سے اُٹھ کر باورچیخانہ کی طرف جا رہی تھیں۔

آج پہلے پہل داماد گھر میں آیا تھا۔ خاطر و تواضع ضروری تھی۔ ماما دایوں پر اس طرح کا کام نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اپنے دل کو اطمینان نہیں ہوتا۔ محبت بھرا دل

پنکھے نہیں بیٹھنے دیتا۔ سعید کوئی غیر بھی تو نہ تھے حقیقی بھتیجے تھے اور انھوں نے اپنی ساری زندگی بھائی اور بھتیجے ہی کے لیے تج دی تھی۔ مثل مشہور ہے کہ ڈائن کو بھی داماد پیارا ہوتا ہے۔ اور نجمہ، ریحانہ کی ماں کے پہلو میں تو اسی طرح کا دل تھا جس طرح کا اُن کے مرحوم بھائی مرزا اسد علی بیگ کے پہلو میں تھا۔

مرزا صاحب کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ دوسروں کے لئے تکلیف اٹھانے میں خاص لذّت محسوس کرتے تھے وہی فطرت نجمہ کی بھی تھی۔ ان سب سے بڑی تمنا۔ سب سے بڑی آرزو اور سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ بھائی کی اولاد پھلے پھولے، شاد آباد رہے۔ اس میں چاہے اپنے پر۔ چاہے اپنی بچی پر کچھ ہی کیوں نہ بن جائے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ عورت ہونے کی حیثیت سے اس طرح کی قربانی اُنکا فرض ہے۔ اُن کے نزدیک عورت کی غرض و غایت تھی مرد کو خوش رکھنا اور اُس کا گھر سنبھالنا۔

وہ اس کے خلاف تھیں کہ عورتیں موٹی موٹی کتابیں پڑھیں، اور بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کریں۔ وہ کہتی تھیں کہ ہمیں نوکریاں نہیں کرنا ہیں اللہ مردوں کو سلامت رکھے، یہ ان کے کام ہیں۔ ان کے نزدیک علم کا مقصد صرف نوکریاں ہی حاصل کرنا تھا۔ وہ اس کے دوسرے فائدوں سے بے خبر تھیں۔ ان کے نزدیک تو عورتوں کے پڑھنے لکھنے میں نقصان ہوتا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ عورتیں پڑھ لکھ کر فضول خرچ ہو جاتی ہیں۔ نہ اپنے بڑوں کا ادب کرتی ہیں اور نہ شوہر کی اطاعت بس جہاں چار حرف پڑھ لئے اور دماغ پھر گیا۔ اچھی بھلی شریف زادیاں خاصی بے شرم ڈومنیاں بن جاتی ہیں۔

ان کا بس چلا ہوتا تو ریحانہ کبھی بھی نہ پڑھ سکی ہوتی۔ وہ تو بھائی کا حکم تھا اور نجمہ کی شریعت میں بڑے بھائی کا حکم باپ کے حکم کے برابر تھا اطاعت اور ایثار

خمیر میں داخل تھے۔ بھائی کے حکم سے سرتابی ناممکن تھی۔ اسی لئے ریحانہ کی تعلیم بھائی کی خواہش کے مطابق ہوتی رہی۔ لیکن اس کی تعلیم کی وجہ سے ریحانہ سے وہ جس قدر محبت کرتی تھیں اتنا ہی گھبراتی بھی تھیں۔ اس کے رنج میں رنج کرنا اور اس کی خوشی پر خوش ہونا تو ممتا کی وجہ سے تھا اس میں وہ مجبور تھیں۔ اپنی بیٹی کلیجہ کا ٹکڑا جگر پارہ تھی اس کے دُکھ سُکھ میں شریک ہونا فطری تھا۔ لیکن خیالات کے فرق نے اُن کے درمیان ایک چھوٹی سی دیوار بھی کھڑی کر دی تھی۔ ایک طرف پُرانی سی پُرانی رسموں کی پابندی پر اصرار تھا تو دوسری جانب نئے سے نئے نظریوں کا پرچار تھا۔ ایک طرف وہم پرستیوں میں گرفتار دقیانوسی ہندوستانیت تھی تو دوسری جانب پابندیوں اور قیدوں کو مٹانے والی نئی تہذیب۔ ماں اگر یہ کہتی کہ بیٹی عورت کی بخشش اسی میں ہے کہ وہ مرد کے پاؤں دھو دھو کے پیئے تو بیٹی کہتی کہ اگر عورت مرد کی ماں ہے اور جنّت اسی کے پاؤں کے نیچے ہے۔ ماں اگر ڈانٹتی کہ تمھیں سعید کی عزت کرنا چاہیئے وہ تمہارا شوہر ہے تو بیٹی تراق سے جواب دیتی کہ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میں ان سے زیادہ پڑھی لکھی ہوں اور عزت علم کی ہوتی ہے نہ کہ جہالت کی۔

چنانچہ بیٹی کے ان خیالات نے ماں کو سعید کا بڑا سخت طرف دار بنا دیا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ریحانہ بہت چل نکلی ہے۔ سعید کو اس کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حق ہے، اور اُسے پیش آنا ہی چاہیئے۔ انھوں نے سعید کو ریحانہ کے کمرے میں جانے سے پہلے گول گول لفظوں میں کچھ اسی طرح کی نصیحت بھی کی تھی۔ وہاں وہ پہلے ہی سے بہت سی ایسی باتیں سوچ کر آئے تھے۔ پھوپھی کی اجازت نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ وہ بڑے بڑے ارادے کر کے ریحانہ کے کمرے میں داخل ہوئے تھے مگر شکاری خود شکار بن گیا تھا اور ریحانہ کے چند ہی جملوں نے انھیں

کمرے سے اس طرح بھگا دیا تھا جس طرح علم جہالت کو بھگا دیتا ہے یا آفتاب کی کرنیں تاریکی کو۔ فقط۔

تیسری قسط

(ازل احمد)

(۵)

جس وقت سعید ریحانہ کے پاس سے اُٹھ کر صحن میں آئے تو پھوپھی انہیں بدحواس دیکھ کر کہنے لگی "کیوں بھیّا نصیب دشمناں طبیعت تو اچھی ہے؟"

"ہاں، نہیں۔ پھوپھی جان۔ نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے" گھبراہٹ میں سعید نے جواب دیا۔

"تو بھیّا تخت پر مصلّی بچھا ہے نماز پڑھ کے ذرا سا ناشتہ کر لو پہلی دفعہ تو آئے ہو" نجمہ کے لئے رسم ورواج کی پابندی ضروری چیز تھی۔ داماد سے ہمدردی بھی تھی اور میاں بیوی کی ملاقات کا نتیجہ سُننے کی جستجو بھی۔ اس لئے پھر کہا۔ "نا بھیّا میں بغیر کچھ کھلائے تو نہ جانے دوں گی۔" اور پھر ماما کو آواز دے کر کہا۔ "اری نصیبن وضو کو پانی جلد رکھ دے۔"

"پھوپھی جان وضو تو میرا ہے۔ مسجد کی نماز کا زیادہ ثواب ہے۔"

"اے بھیّا ثواب پھر کما لینا۔ یہ تو کبھی نہ ہو گا کہ منہ جھوٹا کئے بغیر چلا جانے دوں۔"

"بہت اچھا پھوپھی جان میں نماز پڑھ کے آجاؤں گا۔" کہتے ہوئے مولانا سعید دروازے سے باہر نکل گئے۔ نجمہ نے ماما کو آواز دی "نصیبن ذرا مربّے کا بویام لے آ۔ سعید میاں ابھی آ کے ناشتہ کریں گے۔" یہ کہتی ہوئی ریحانہ کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ادھر سعید نے پیٹھ پھیری اُدھر ریحانہ کی طبیعت پر ردِعمل شروع ہو گیا

تھا۔ مذاق سے مزا لینے اور طنز سے لطف پانے کی حالت فوراً دور ہو کر یہ حقیقت اس کے سامنے آگئی کہ اس شخص کے ساتھ عمر تیر کرنا ہے۔ ایسے کے ساتھ جو خاندانی ریاست کی فضا میں پل بڑھ کر اوگھڑ رہا ہو، امارت کی تہذیب اور ستھرے پن کے ماحول میں بڑا ہو کر انگھڑ رہا ہو۔ اس کے ساتھ یہ پہاڑسی زندگی کیسے کٹے گی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ خاندان بات اور شرافت کی آن رکھنے کے لئے اگر نباہ کیا جائے تو کیا صاف ستھرے کپڑوں کے بدلے موٹا اور بھدا لباس پہننا پڑے گا۔ سب لکھا پڑھا بھلا دینا پڑے گا۔ اپنی ہستی فنا کر دینی پڑے گی۔ اور اگر یہ ناممکن ممکن بھی ہو جائے تو اس ہیئت کذائی کو دل میں جگہ دینا کیونکر ممکن ہوگا جو شادی کا مقصد پورا ہونے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی ریحانہ کے خیال نے سعید کو خلوت میں سامنے کر دیا۔ یہ ایک ایسی تصویر تھی جسے ریحانہ کا احساس سہار نہ سکتا تھا۔ مگر تھی زندگی کی ایک حقیقت۔ وہ اس کا شوہر تھا، اس خیال کا آنا تھا کہ ریحانہ کے مُنہ سے دبی سی چیخ نکل گئی۔ وہ ہاتھوں میں مُنہ چھپا کر رونے لگی۔ ماں نے اُس کی چیخ دروازے میں داخل ہوتے ہوئے سُن لی اور مامتا سے بیتاب ہو کر کہتی ہوئی بڑھی کہ اماں واری ایسی کیا بات ہو گئی اور پاس پہنچ کر بیٹی کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ کر کوچ پر برابر بیٹھ گئی۔ ریحانہ نے ماں کی مامتا بھری آواز کو دمساز سمجھا اور اُس کے زانو پر مُنہ رکھ کر روتی رہی۔

"بیٹی سعید نے کچھ کہہ دیا ہے تو خیال نہ کرنا چاہیئے۔ شوہر کہا سُنا ہی کرتے ہیں۔ ایسے کب تک جان ہلکان کیا کرو گی۔"

"امی کیا وہ ایسے ہی رہیں گے۔ بچپنے میں تو بڑے سلیقہ مند تھے۔ ماموں میاں کاش بھاؤ تو آنا لو چدار تھا اور یہ ایسے روڑھے اُٹھے۔"

"لڑکی کیا تو میرے مرے بھائی کو نام رکھتی ہے۔"

"نہیں امی میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ آخر یہ پلے بڑھے تو اُن کی گود میں باپ کا کچھ تو اثر ہوتا تعلیم نہ سہی تربیت کہاں چلی گئی۔ ماموں میاں کی آنکھیں دیکھ کر تو انسان بن جائیں اور خاص بیٹا وحشی۔ یہ ہو کیسے سکا۔"

ریحانہ زباں بند کر۔ شوہر کی یہ بے حرمتی! شریف بچیوں کو ایسی دیدہ دلیری زیب نہیں دیتی۔ تیرے یہ لچھن مجھے نکو بنا چھوڑیں گے۔"

"امی جان خفا نہ ہو جئے۔ میں اُن کی بے توقیری نہیں کر رہی ہوں۔ پر ذرا سوچئے تو سہی۔ اُن کی یہ چال ڈھال کس کو بھا سکتی ہے۔

"بیٹا اللہ نے اُس کا دل دُنیا کی دکھاوٹ سے ہٹا دیا ہے۔ ہر وقت روزہ نماز اور خدا سے دھیان ہے۔ ایسا نیک چلن میاں نصیبے والی کو ملتا ہے۔ رہ گیا پہناوا سو تو اگر حکمت عملی سے کام لے گی تو چار دن میں بدل جائے گا۔ میں کہتی ہوں بیوی اگر سمجھدار ہو تو میاں کو شیشہ میں اُتار سکتی ہے۔"

"امی ایسے شوہر سے تو وہ جاہل اچھا جو بات کو سمجھ اور سمجھا سکے۔"

"اس نگوڑی انگریزی پڑھائی سے بچی تیرے تو دیدوں کا پانی بھی ڈھل گیا۔"

آپ کو امی میں کیسے سمجھاؤں کہ جسے آپ دیدوں کا پانی ڈھل جانا کہتی ہیں وہ عورت کے شعور ذات کا نتیجہ ہے۔ جس چیز کو اب شرم و حیا کہا جاتا ہے وہ عورت کی ہستی مٹ جانے یا بیکسی اور بے بسی کا نتیجہ تھا پرانے رسم و رواج نے ہندوستانی عورت کو خانہ داری کے سامان کی ایک بے جان چیز بنا دیا تھا اور رسم و رواج اس زمانہ کے حالات اور ضرورت کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ آج حالات دوسرے اور ضرورت بدلی ہوئی ہے۔ پرانے طریقے اب قائم نہیں رہ سکتے۔ ہندوستان کی آدھی آبادی کو جب اپنی ذات کا شعور ہوگا۔ تو وہ شوہر کی ملک نہیں رہ سکتی۔ وہ اس کی برابری کی حصہ دار ہے

اور قومی ترقی کی ذمہ دار ہے۔"

"بیٹی تجھ سے زبان کون لڑائے اور کب تک لڑائے۔ سعید میاں آتے ہوں گے میں انھیں ذرا سا کھلا دوں۔" ریحانہ کی ماں یہ کہتی ہوئی صحن میں چلی گئی۔ ریحانہ کی زبان پر یہ بات آ کے رہ گئی کہ وہ سعید کو نکاح فسخ کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے ماں سے کہہ دے۔

(۶)

سعید جب ریحانہ کے کمرے سے نکلے تو اگر ایک طرف ان کے معاشری خیالات کو صدمہ پہونچا تو دوسری جانب نوعمری کے حواس اور جنسی جذبات بھی جاگ گئے تھے۔ اس وقت کی شکست سے جو صدمہ ان کے پندار کو پہنچا تھا پھوپھی کی ہمدردی اور محبت کے اظہار نے اس میں کمی کر دی تھی اور گھر میں پہونچتے پہونچتے ذلت اور خفت کا احساس کافور ہو کر ان کے خیال کی بساط پر ریحانہ کی تصویر باقی رہ گئی۔ اب مولانا سعید کے دماغ یا خیال میں ریحانہ کی مسکراتی مورتی رکھی تھی اور وہ اس مسکراہٹ سے اس طرح سرور حاصل کر رہے تھے۔ جس طرح شراب کا گھونٹ لینے کے بعد شرابی ہونٹ چاٹتا ہے۔ سعید نے لاکھ چاہا کہ وہ ان خیالات کو دماغ سے دور کر دیں مگر ریحانہ کی دلکشی ان کے خیال پر چھائی رہی۔ اُن کے پندار کو یہ بات بُری معلوم ہوئی۔ بار بار لاحول پڑھی۔ لیکن وہ شوق آفریں تصور بھلایا نہ جا سکا۔ سعید اپنی اس کمزوری پر خفا اور ملول تھے۔ نماز کی نیت باندھ لی۔ مگر نماز میں بھی ریحانہ کا خیال قائم رہا۔ یہ نقش تصور کی ایک ایسی لذت تھی۔ نظارہ کی ایک ایسی کیفیت تھی۔ جس کے مزے کو سعید کے جذبات کا اکساؤ جھٹلا نہ سکتا تھا وہ نماز میں بے خیال ہی رہے۔ مگر ساتھ ہی انھیں یہ صورت حال بے آرام بھی کئے ہوئی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ریحانہ کی دلکش جوانی اور ناز بھری ادائیں سعید کے حواس پر چھا گئی تھیں۔ ان کا یہ خیال کہ ریحانہ کا تصور ان کی نماز میں مخل ہوا در اصل ایک فریب نفس تھا۔ ان کو اس خیال میں کہ ریحانہ کتنی حسین اور کتنی دلفریب ہے مزا آ رہا تھا اور یہ خیال ہی انھیں پھوپھی کے پاس لے پہنچا۔ ورنہ ممکن تھا کہ کوئی حیلہ بہانہ کر بیٹھتے۔ سعید نے تسلیم کی پھوپھی نے دعا دی "آؤ بھیا عمر دراز ہو۔" پھر ماما کو پکارا۔ "اری نصیبن۔ سعید میاں آ گئے۔ چار بھگونا۔" آگے آگے پھوپھی اور پیچھے سعید دالان میں پہنچے۔ چوکیوں پر سفید چاندنی کا فرش اوپر قالین اور سامنے دستر خوان پر ناشتہ چنا تھا۔ سعید گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئے۔ نصیبن چار کی ترپل سجا کر لے آئی اور پھوپھی نے مٹھائیوں پھلوں اور مربے کی قابیں بڑھا کر کہا۔

"لو بھیا ذرا سا کچھ کھا لو۔"

پھوپھی داماد کو دستر خوان کی ہمہ نعمت کھلا دینا چاہتی تھی اور سعید ان کا دل میلا نہ کرنا چاہتے تھے۔ غرض ناشتہ ختم ہوا۔ گلوریاں آئیں اور سعید نے یکے بعد دیگرے تین گلوریاں منہ میں رکھ لیں۔ چٹکی بھر زردہ ہر دفعہ ڈالا۔ زردہ چونکہ نشیات میں داخل نہیں۔ اس لئے شاید وہ اس کی کسر زردہ کھا کر نکالنا چاہتے تھے۔ اب سعید کو یہ مشکل پیش آئی کہ بات کی ابتدا کیونکر کریں۔ لیکن ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ پھوپھی جان آپ کی صاحبزادی۔"

سعید کی بات پوری نہ ہونے دی اور وہ کہنے لگیں۔

"بھیا الھڑ ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا۔ ذرا تسلی دلاسے سے کام لینا پڑے گا۔ جیسے تمہاری بیٹھ پھری ہے آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی۔"

"واہ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ پھوپھی جان میں نے تو اُن سے بات بھی نہیں کی۔"

"بات تو تمھیں کرنا چاہیئے تھی بھیا۔ تم اس کے میاں ہو۔"

"بات کیا کرتا۔ اُن کو تو میرا جوتہ صاف کرانے کی فکر پڑ گئی تھی۔"

"اللہ میرے بھائی کی کروٹ کروٹ پھول برسیں۔ پر جب کبھی میں نے کہا۔ اُنھوں نے مجھی کو پاگل بنایا اور اس نگوڑ ماری میم کی پڑھائی جاری رکھی۔ اُسی نے میری بچّی کی خو بگاڑی۔ اب بھیا تم پتّا مار کر کام لو گے تو چند دن میں سُدھر جائے گی۔"

"پھوپھی جان اُن کو تو آپ ہی سمجھا سکتی ہیں۔ میں۔"

"بیٹا میں تو سمجھاتی رہتی ہوں پر تمھاری ڈانٹ ڈپٹ اور پیار اخلاص کی اور بات ہے۔"

اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی اور سعید اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"پھوپھی جان میں چاہتا ہوں کہ رُخصتی کی رسم جلد عمل میں آئے۔ مگر اس سے پہلے چاہتا ہوں کہ آپ کی صاحبزادی بے غیرتی کا پہناوا ترک کر دیں۔ آپ پہلے اُنھیں سمجھا دیجیئے کہ اگر اُنھوں نے جلد تبدیلی نہ کی تو میں کوئی دوسرا رشتہ تلاش کرنے پر مجبور ہونگا۔" یہ سُنکر پھوپھی کے تو اوسان خطا ہو گئے، اور سعید چلے گئے۔ ریحانہ کی ماں چاہتی تو خود بھی یہی تھی مگر اس کے سمجھانے کی حد بس ایک آدھ جملہ کہدینے تک تھی۔ بچپنے میں بھی اُنھوں نے اپنی بات منوانے کے لئے ریحانہ پر کبھی سختی نہ کی تھی۔ اس پر ماموں کا لاڈ پیار کا اضافہ تھا کہ جب کبھی ماں نے ریحانہ کی شوخی شرارت کی شکایت کی تو اُنھوں نے ہنس کر ٹال اُسے پیار کیا۔ اب بجمہ غریب اس تردد میں مُبتلا تھی کہ خدانخواستہ اگر سعید نے دوسرا نکاح کیا تو خاندانی علاقہ دوسروں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔

(۷)

سعید جس وقت دیوان خانہ میں جا کر بیٹھے تو انھیں شدید آرزو تھی کہ ریحانہ سے بے تکلفی کی ملاقات ہو۔ مگر اس کی ملاقات اور شیرنی کے بھٹ میں جانا برابر معلوم ہوتا تھا۔ یہ ایک ایسی مشکل تھی جس نے ان کا اطمینانِ قلب کھو دیا تھا۔ مرزا صاحب کے انتقال کے بعد سے دیوانخانہ غیر آباد رہنے لگا تھا۔ آنے جانے والوں میں سعید کے حال دقال کے دو چار رفیق تھے۔ پُرانے آنے جانے والوں میں سے کوئی نہ آیا تو میاں سعید اکثر اکیلے بیٹھے "تذکرۃ الاولیا" پڑھا کرتے تھے۔ البتہ اتوار کے روز شام کے وقت بابو کامتا پرشاد و کیل ضرور آتے تھے۔ پُرانی وضعداری اور رفاقت کا حق ادا کرتے اور ایک ایک کی خیریت دریافت کرتے۔ بہن کو تسکین اور بچّی کو دُعا پہنچاتے۔ چند منٹ بیٹھتے اور چلے جاتے تھے۔ بابو کامتا پرشاد مرزا صاحب کے ہم مکتب اور ساری عمر کے دوست اور جلیس تھے، اور انسانیت اور شرافت کا نمونہ تھے۔ کبیر اور سعدی کی تعلیمات نے جس کا خمیر تیار کیا تھا۔

اس وقت پیرزادہ غلام صابر تشریف لے آئے۔ جن کو سعید کے مزاج میں زیادہ دخل تھا۔ بیٹھتے ہی کہنے لگے۔ "آج آپ کچھ متوحش سے ہیں خیر تو ہے؟"

"الحمدللہ سب خیریت ہے۔ البتہ کچھ خانگی اُلجھن ضرور پیدا ہو گئی ہے۔"

"واہ آپ جیسے لوگوں کو دُنیا پریشان کرے۔ اللہ کے نام اور کلام میں وہ تاثیر ہے کہ پہاڑ سرمہ ہو جائیں۔"

"وقت پیرزادہ صاحب یہ آپڑی ہے کہ ابّا میاں مرحوم نے میرا نکاح اپنی بہن کی لڑکی سے کر دیا تھا اور رخصتی کرائی نہ تھی۔ بھابی کو تعلیم بھی انھوں نے میم سے دلائی جس نے اُن کا دماغ خراب کر دیا۔ اب وہ میم اور میں سیدھا سچا مسلمان۔"

"اجی حضرت بیوی بھی ایسی چیز ہو گئی کہ ایک مرد مسلمان پریشان ہو۔ بھئی اگر مرضی کے مطابق نہیں تو طلاق کیوں روا رکھی گئی ہے؟"

"مگر پیرزادہ صاحب والد مرحوم کی کی ہوئی شادی۔ سگی پھوپھی کی لڑکی دُنیا نام دھرے گی پھر زمینداری میں ورثے کی حقدار بھی۔ میں تالیفِ قلب کر کے ڈھنگ پر لانا چاہتا ہوں۔"

"تو یہ فرمایئے کہ حضرتِ عشق نے سر پر سایہ ڈالا ہے۔ حضرت جن نہیں ٹھہر سکتا تو عورت ذات کی بساط ہی کیا ہے۔ میرے پاس تسخیر کا ایک عمل ہے۔ مگر بہت محنت کا اور بخشنے کی اجازت نہیں خود ہی پڑھوں تو ہو۔ جلالی عمل ہے۔ بدن آدھا رہ جاتا ہے۔ اور کئی مہینہ میں صحت پلٹتی ہے۔"

"تو مولانا پھر کارِ خیر میں مدد فرمایئے۔"

"جی ایک پیر بھائی کے کام میں آنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں مگر دارالعلوم سے چھٹی ملنا دشوار ہے۔"

"مگر چھٹی تو بے تنخواہ لی جاسکتی ہے اور میں کسی خدمت سے باہر نہیں۔ آپ درخواست دے دیجئے۔ کارندہ ہر مہینہ دُہرا مشاہرہ پہنچا دیا کرے گا۔

عشاء کی اذان ہوئی اور مولانا سعید امیدوں سے بھرا دل لئے اور جل شانہٗ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ شام کے وقت بابو کامتا پرشاد معمول کے مطابق آئے۔ نام بنام خیریت پوچھی اور تھوڑی دیر بیٹھ کر جانے لگے تو سعید کی طبیعت نہ مانی اور اپنی مشکل اُن کے سامنے بھی پیش کر دی۔ تاکہ وہ ریحانہ کو فہمائش کر کے صحیح راستہ پر لانے میں اُس کی مدد کریں۔

ریحانہ بھی سعید کی طرح بابو جی کی گود کی کھیلی تھی، اور ان کو اُس کی تیزی اور ذہانت کے باعث اُس سے خاص اُنس بھی تھا۔ مس ڈکروز انہیں کے مشورہ سے ریحانہ کی تعلیم کے لئے رکھی گئی تھی اور اُس کی زبانی ریحانہ کی تعلیمی ترقی سن سن کر بابو جی کو سچّی خوشی ہوتی تھی۔ اس وقت سعید نے چونکہ خود ابتدا کی تھی۔ اُن کو

موقع مل گیا کہ سعید کو کچھ فہمائش کریں۔ چنانچہ کہنے لگے۔

"میاں تم چاہتے ہو کہ ریحانہ کے ذہن و دماغ کو تعلیم سے جو روشنی پہنچی اور اس کے خیال میں جو وسعت آئی اُسے ہٹا دیا جائے۔ تم یہ بھی چاہتے ہو کہ ریحانہ نے جو تہذیب و تمیز حاصل کی ہے اُسے کالعدم کر کے تمہاری مرضی کے مطابق وضع و قطع بنائے۔ لیکن تم یہ تو مانو گے کہ وہ تمہاری بیوی ہے۔ اس سے بھی شاید انکار نہ کر سکو گے کہ مذہب نے اُسے بھی حق حقوق دیئے ہیں۔ پھر وہ تمہارے طور طریق میں تبدیلی کی خواہش کرے آخر اُس کے بھی دل ہے۔ اس کے دل میں بھی خواہش پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ اگر تم سے یہ کہے کہ اپنے طبقہ کے دوسرے لوگوں کی سی وضع قطع تم بھی اختیار کرو۔ اور یہ جو حالت بنا رکھی ہے اُسے ناپسند ہے۔ تو تم کیا جواب دے سکتے ہو۔ میں آج تم سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ نیکی لباس میں نہیں۔ بلکہ دل میں ہوتی ہے" درویش صفت باش کلاہِ تتری دار" پہ عمل کرو کسی خاص قسم کی وضع بنانا دراصل نفس کا فریب ہے۔ پاک نفسی تو اس میں ہے کہ انسان دوسروں کی دلداری کے لئے اپنی خواہشوں کو قربان کر دے" دل بدست آور کہ حج اکبر است" اسی حکیم کا دوسرا قول ہے۔ اس لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم پہلے اپنی حالت میں کچھ تبدیلی پیدا کرو۔ پھر تم خود یعنی تمہارا برتاؤ اور چلن ریحانہ کو بھی تمہاری مرضی کا تابع بنا دے گا۔ جو شکل تم نے بنا رکھی ہے۔ وہ کم سے کم ایک پڑھی لکھی لڑکی کے لئے گوارا نہ ہوگی۔ اس پر تم غور کرنا۔ اس کے بعد پھر مجھے بتانا کہ آیا مجھے ریحانہ کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔"

یہ کہکر بابو جی رخصت ہو گئے، اور سعید کو چُپ رہنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ فقط

چوتھی قسط

(از سید سجاد حیدر یلدرم)

(۷)

سعید بیگ۔ مولانا سعید بیگ جو مولانا سے قبل اور مولانا ہونے کے باوجود ایک صحت مند نوجوان مرد تھے۔ ریحانہ کے بُت کو اپنے کعبۂ دل میں متمکن پاتے تھے۔ اُن کا دماغ اُس کے لباس کی عریانی اُس کی گفتگو کی آزادی اور آزادی سے بڑھکر اُس کے تلخ و تیز طنز کو جس نے اُن کے احساس خودداری کو زبردست ٹھیس لگائی تھی۔ بیش کرتا تھا۔ مگر فوراً ہی دل میں وہ دلکش شکل پھر جاتی تھی اور وہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ اس لباس نے جس کا شرعی رُو سے ہرگز جواز کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ریحانہ کو کس قدر دلفریب بنا دیا تھا۔ مولانا سعید نسوانی حسن کے مبصر نہ تھے۔ ان کے مشاغل نے انھیں جنس لطیف سے دُور رکھا تھا اور اس سے دُور رہنا وہ اپنے مسلک کے مطابق از حد ضروری بھی سمجھتے تھے۔ لیکن ہُوا کیا؟ پہلے ہی موقع پر جنسی کشش کا حملہ اُن پر اتنا زبردست ہوا کہ وہ اس راستہ پر پڑ لیے جو اُنھیں اپنے خود ساختہ اُصولِ زندگی سے دُور لے جا رہا تھا۔ بابو کامتا پرشاد کی نصیحت اور مشورہ نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے خیالات اور اپنے ارادوں کا جائزہ لیں کیا انھیں ایک الٹی میٹم بھیج دینا چاہیے کہ وہ اپنے اختیارات شوہری کا استعمال رُخصتی سے قبل ہی کرنا شروع کر دیں گے اور ساڑی اور کُھلی بانہیں اور کُھلے گلے کو قطعاً ممنوع قرار دے کر ریحانہ کو اپنے

ملبوس میں اوروں کے سامنے کیا اپنے سامنے بھی نہ آنے دیں گے یا یہ مناسب ہوگا جیسا کہ بابو کامتا پرشاد نے صلاح دی تھی کہ وہ خود اپنی حالت میں تبدیلی کریں اور خود اپنی شکل ایسی بنائیں جو ایک پڑھی لکھی لڑکی کو اور صاف یہی کیوں نہ قبول کر لیا جائے کہ ریحانہ کو گوارا ہو۔

ایک ذہنی مباحثہ اور کشمکش کے بعد اُنھوں نے دوسری شق کو ترجیح دی۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے لباس اور اپنی وضع میں مناسب ترمیم کریں گے، یعنی پیرزادے غلام صابر کے عمل نے جو وہ ریحانہ کی تسخیر کے لئے پڑھ رہے تھے اُلٹی سیفی کا کام کیا۔

(۸)

مس ڈکروزا جس نے ریحانہ کو انگریزی پڑھائی تھی۔ اب بھی ریحانہ کے پاس آتی جاتی تھی۔ ریحانہ کے علاوہ مس ڈکروزا نے چند اور گھرانوں میں بھی پڑھایا تھا۔ اُن میں ایک گھر احمد علی صاحب وکیل کا تھا۔ احمد علی صاحب اپنے شہر کے سربرآوردہ اور کامیاب وکیل تھے۔ محض اپنی لیاقت اور محنت کی وجہ سے اُنھوں نے وکالت میں اتنا کمایا تھا اور اتنا کما رہے تھے کہ ان کا شمار ضلع کے دولتمند لوگوں میں ہوتا تھا۔ دارانگر اسی ضلع میں ضلع کے قریب ہی واقع تھا۔ مرزا اسد علی بیگ مرحوم اپنی ریاست کے بیشتر مقدمات احمد علی صاحب ہی کے سپرد کرتے تھے۔ احمد علی صاحب قانون و نظائر پر اسقدر حاوی تھے کہ اکثر مقدمات اُن کے ہاتھوں میں سرسبز ہوتے تھے۔ اسد علی اور احمد علی بہت بڑی حد تک نظریہ زندگی میں ہم خیال تھے۔ گو احمد علی جس حد تک جاتے تھے مرزا اسد علی ان کا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ مثلاً گو مرزا صاحب مرحوم لڑکیوں کی تعلیم کے حامی تھے، مگر وہ اس کو پسند نہ کرتے تھے کہ لڑکی مدرسے میں جاکر

کسی دوسرے شہر میں تعلیم کے لئے بھیجی جائے۔ کہنے کو تو وہ کہتے تھے کہ اگر استطاعت ہو تو اچھی سے اچھی معلمہ رکھ کر لڑکی کو کیوں نہ پڑھایا جائے اور کیوں اُسے دوسرے شہر میں بھیجکر بورڈنگ میں رکھ کر ماں کی تربیت سے محروم کیا جائے جو جہاں تک لڑکیوں کی تعلیم کا تعلق ہے۔ بلحاظ ان ذمہ داریوں کے جو لڑکیوں کو ازدواجی زندگی میں پیش آتی ہیں کتابی تعلیم سے زیادہ اہم ہے۔ لیکن اصل میں اس خیال کا حقیقی محرک اپنی بہن کا پاس الفت مادری تھا اگر وہ چاہتے تو ریحانہ کو لکھنؤ یا علی گڑھ کے مسلم گرلس کالج میں آسانی سے بھیج سکتے تھے۔ کیونکہ گو ابتداً لڑکیوں کو دوسرے شہر میں بھیجنے اور بورڈنگ میں رکھنے کی اکثر مخالفت کی جاتی تھی۔ لیکن اب اس مخالفت میں کمی آچکی تھی۔ لوگ بلا تامل اپنی لڑکیاں بھیج رہے تھے۔ مصارف کا خیال تو سدِ راہ ہو ہی نہیں سکتا تھا اور تجربہ ان کی رائے کو اپنی رائے پر ہر وقت مقدم رکھتی تھی۔ مگر وہ سمجھتے تھے کہ بیوہ ماں سے اکلوتی اولاد اور وہ بھی بیٹی کا جدا کرنا کتنی بڑی زیادتی ہوگی۔

احمد علی صاحب ان قیود سے آزاد تھے۔ اُن کی کوئی بیوہ بہن کی بیٹی نہ تھی جس کو ماں سے جدا کرنے کا سوال ہوتا۔ ان کی ایک لڑکی سلمیٰ تھی اور دو لڑکے محمود و مسعود۔ سلمیٰ ریحانہ سے عمر میں شاید دو برس بڑی ہوگی۔ مس ڈکروزا نے سلمیٰ کو اچھی طرح پڑھایا۔ جب وکیل صاحب نے سلمیٰ اور محمود کو علیگڑھ بھیجنے کا فیصلہ کیا تو بیگم احمد علی کی قدرتی مخالفت کو (جو ہر ماں کو تھوڑی بہت اپنی اولاد کو اپنے سے جدا کرنے سے ہوتی ہے) یہ سمجھا کر فرو کیا کہ خیر سے مسعود تمہارے پاس ہیں، تمہارا دل اس سے بہلے گا اور جاہل ناسمجھ ماؤں کی طرح محض اپنی کوکھ سے لگائے رکھنے کی خاطر اپنی اولاد کی تعلیم میں روڑا نہ اٹکاؤ۔

سلمہ کے علیگڑھ چلے جانے کے بعد وکیل صاحب نے بھی مس ڈکروزا

کو مرزا اسد علی بیگ سے سفارش کرکے ریحانہ کی تعلیم کیلئے رکھوا دیا۔ احمد علی صاحب اور مرزا صاحب کے تعلقات اب محض وکیل اور موکل کے نہ رہے تھے بلکہ وہ دونوں گہرے دوست تھے اور ایک دوسرے کے سچے خیر خواہ تھے۔ مس ڈکروزا کو فوراً مرزا صاحب نے بڑی خوشی سے ریحانہ کی تعلیم کے لئے مقرر کر لیا۔

ریحانہ اور سلمہ اس طرح ایک اُستانی کی شاگرد تھیں اور ویسے بھی اُن کے تعلقات دو بہنوں کے سے تھے۔ سلمہ علی گڑھ گرلس کالج میں اس وقت بی۔ اے میں پڑھ رہی تھی۔ یعنی جس وقت کہ ریحانہ کی رخصتی کا سوال درپیش تھا۔ بڑی چھٹیوں میں سلمہ جو گھر آئی تو ریحانہ سے ملنے گئی واقعات کی رفتار سے وہ واقف تھی۔ وہ سُن چکی تھی کہ ریحانہ کی رخصتی ہونیوالی ہے اور دو ہمسن اور پرانی بے تکلف لڑکیوں میں اس سلسلہ میں چھیڑ چھاڑ کا ہونا لازمی تھا۔ نجمہ کو سلام کرکے اور تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھ کر اور دعائیں لے کر سلمہ ریحانہ کے ساتھ اس کے کمرے میں گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ریحانہ کو گدگداکے بولی "۔ لو اب آپ حقیقی معنوں میں بیگم سعید بیگ ہو جائیں گی۔ بھئی ہم اس کے قائل نہیں کہ نکاح کرکے لڑکی کو لٹکائے رکھنا دل میں اُمنگیں ہی کیوں پیدا کی جاتی ہیں۔ مجھے تو جھٹ منگنی پٹ بیاہ پسند ہے۔ مصرعہ

قریب آنا دلِ مایوس کے پھر دُور ہو جانا

ظلم صریح ہے، اور آج کل کے اخباروں کی زبان میں استبداد مطلق ــ "

ریحانہ یہ تو جانتی تھی کہ اُس کے پکے پھوڑے کو ٹھیس لگائی جائے گی، مگر یہ نہ سمجھتی تھی کہ اس قدر جلد۔ وہ امید کرتی تھی کہ سلمہ اپنے کالج کے حالات سنائیگی اپنی پڑھائی کے متعلق گفتگو کرے گی جو نئی کتابیں اُنھوں نے اس عرصہ میں پڑھی ہیں اُن پر تبادلۂ خیالات ہوگا اور شورت کتنی ہی علمی فضا میں پرواز کرے۔

اس سطح پر ضرور آجاتی ہے اُنی ساریوں اور جمپروں کے بارے میں اس کی رائے لے گی اور اس عرصہ میں اُس نے کیا کیا خریداری کی۔ مگر اُس نے تو جھُری تلے دم لینے ہی نہیں دیا۔ کس بیدردی سے اس کو چھینٹے دے رہی ہے۔

ریحانہ کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور ایک بھرائی آواز سے جس نے سلمہ کے سارے مذاق کو ایک دم مُبدّل بہ ترحّم کر دیا۔ اس نے کہا کہ "سلمہ میں یہ تو مان نہیں سکتی کہ تم بے خبر ہو نہ مجھے اس کا یقین ہے کہ تم مجھ سے ہمدردی نہیں رکھتی ہو۔ بات یہ ہے کہ تم اس اثر سے واقف نہیں ہو۔ جو فقرے میرے دل پر کر سکتے ہیں۔"

کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

یہ کہہ کے وہ اپنے ڈبڈبائے ہوئے آنسوؤں کو روک نہ سکی۔ بند ٹوٹ گیا اور سیلاب باہر آگیا۔

سلمہ نے اپنی سخت غلطی کا احساس جو بے خیالی میں اُس سے سرزد ہوئی تھی۔ اب کیا۔ اُس نے ریحانہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اُس کے تمتمائے ہوئے چہرے کو جس پر سلمہ کے آنسو گر کر ریحانہ کے آنسوؤں میں مل رہے تھے۔ چومنا شروع کیا۔ اور کہنے لگی "پیاری بہن میری بہن ﷲ مجھے معاف کر دو، مجھے ہرگز اس کا گمان بھی نہ تھا کہ میرا مذاق تمھیں اتنا بُرا معلوم ہو گا۔ کہو تم نے معاف کیا"

ریحانہ نے اپنا سر سلما کے کندھے پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہیں۔ ریحانہ نے سر اُٹھایا۔ ابرِ غم برس چکا تھا لیکن اب نہ علی گڑھ کے متعلق سوالات تھے۔ نہ کتابوں نہ تازہ رسالوں کی تنقیدیں۔

ریحانہ کی کتاب زندگی کا ورق اتنا دلدوز تھا کہ اور کتابیں پڑی کی پڑی رہ گئیں۔ اب دونوں آہستہ آہستہ لیکن نہایت سنجیدگی سے جس میں

مذاق اور ہنسی کا شائبہ بھی نہیں باتیں کر رہی ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد سلما رخصت ہوئی۔ ریحانہ میں اتنی سکت نہ تھی کہ رخصت کرنے کے لئے کمرے سے باہر آئے۔

(۹)

یا ﷲ سلمہ کیوں آئی۔ نہ آئی ہوتی تو اچھا تھا۔ اس شدید تلاطم کا یہ ضعیف دل کیونکر متحمل ہو گا۔ میں مصیبت میں مبتلا تھی لیکن وہ میری کشتی کو چٹانوں سے ٹکرا گئی۔ کہتی ہے کہ "کاش چچا جان آپ کو یوں پابند نہ کر گئے ہوتے۔ مشرق اور مغرب کو اس طرح ملایا جا سکتا ہے۔ محمود کیا، اچھا ڈاکا کلاہے کلاس میں اول۔ ہوب کا ذوق کتنا پاکیزہ شاعری کا کیسا صحیح مذاق اور عورت کو جس تحتِ احترام پہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا اندازہ تو کچھ اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب اس کے محبوب موضوع پر اس سے کوئی گفتگو کی جائے۔ یا زیادہ صحیح یہ کہ جب وہ خود عالم استغراق میں اس موضوع پہ گفتگو کرے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ دونوں ہستیاں ملکر اپنی زندگی کو گل پاش اور گل ریز کریں۔ میں ان بیڑیوں کو جو دوسرے ہماری رائے ہماری آرزو کے خلاف ہمارے پاؤں میں ڈالدیں کاٹنا توڑنا موجودہ سوسائٹی کا اور سوسائٹی میں اُن ضعیف ہاتھوں کا (اس نے اپنے اور میرے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرکے کہا) فرض سمجھتی ہوں۔

کیا خوب محض اس غرض سے کہ خاندانی جائداد کے ٹکڑے نہ ہوں دو متضاد خیالات اور متضاد تربیت والی شخصیتوں کو ایک جوئے میں جوتا جاتا ہے۔ جائداد کے ٹکڑے نہ ہوں دلوں کے ٹکڑے ہو جائیں۔ ہمارا کام اطاعت۔ ہمارا فرض فرمانبرداری قرار دیا گیا ہے۔ مگر فرمانبرداری اور اطاعت کی ایک حد ہوتی ہے۔ سوسائٹی کی قربانگاہ پہ کب تک ہم بھینٹ چڑھائے جائیں گے میں سمجھتا ہوں کہ بغیر سوچے سمجھے سلما کی زبان سے یہ سب کچھ نکل گیا۔

یا کیا ایک سازش کا نتیجہ ہے۔ کل مس ڈکروزا آئی تھیں وہ بھی کچھ گول گول اس قسم کی تقریر کر گئیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ مس ڈکروزا اور سلمانے پہلے یہ صلاح کر لی ہو کہ اول مس صاحبہ زمین تیار کرینگی اور پھر سلمہ اسکی تخم ریزی کریگی۔

سلمہ کے چلے جانے کے بعد ریحانہ اپنے صوفہ پر نڈھال پڑی ہوئی یہ باتیں اپنے دل سے کر رہی تھی۔ ریحانہ کی تعلیم گھر پر ہوئی تھی۔ اس نے کسی مدرسہ یا کالج کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے۔ کالج میں عام اس سے کہ وہ لڑکوں کے ہوں یا لڑکیوں کے زندگی کے تمام شعبوں یعنی مذہب پالٹکس، سوسائٹی کے تعلقات پر جو ہیجان انگیز اور بغاوت آمیز مباحثات بورڈنگ کے کمروں میں، کلاس روم میں، کھانے کے وقت، کھیل کے وقت ہوتے رہتے ہیں۔ اُن میں شرکت کا اُسے کبھی موقع نہ ملا تھا۔ اگر امتحانات کے معیار سے اس کی تعلیم کو جانچا جائے تو اس کی تعلیم کوئی اعلیٰ تعلیم نہ تھی۔ لیکن کچھ تو فطری شوق کی بنا پر اور کچھ اس سبب سے کہ تنہائی اور فرصت نے اسے اس طرف مائل کیا کہ وہ اپنا وقت زیادہ تر مطالعہ میں صرف کرتی تھی۔ لیکن کچھ تو فطری شوق کی بنا پر اور کچھ اس سبب سے کہ تنہائی اور فرصت نے اسے اس طرف مائل کیا کہ وہ اپنا وقت زیادہ تر مطالعہ میں صرف کرتی تھی۔ اس کا مطالعہ ایک حیرت انگیز حد تک وسیع اور گہرا تھا۔ اُردو اور انگریزی لٹریچر کی اچھی اچھی کتابیں اس کی نظر سے گذرتی رہتی تھیں اور وہ کمرے کے سکوت و سکون میں اُن سے لطف اندوز بھی ہوتی تھی اور اُن پر غور بھی کرتی تھی۔

سلمہ کی ملاقات نے اس کے خیالات میں ایک زبردست تلاطم پیدا کیا۔ کسی اور لڑکی کے سامنے یہ خیالات ظاہر کئے جاتے تو شاید اس کے دل و دماغ میں یہ ہیجان پیدا نہ ہوتا۔ مگر جن حالات و واقعات نے ریحانہ کا احاطہ کر رکھا تھا اس شعور اس دماغ اس علم اور اس صاحب احساس لڑکی

کے سکون و توازن میں خلل انداز ہونا ایک لازمی امر تھا۔ اس کا حافظہ قوی تھا Iboen کا ڈرامہ The Doll's House "گڑیا کا گھروندا" پڑھ چکی تھی اور اس نے ایک دیرپا اثر اس کے دماغ پر چھوڑا تھا۔ گولڈ اسمتھ کا She stoops to conpver اس کے مطالعہ سے گذر چکا تھا۔ وہ اس سے بھی متاثر ہوئی تھی۔ پریم چند کے افسانے بھی اس نے پڑھے تھے۔ پتی سیوا اور شوہر کی اطاعت اس کا پیام تھا اور خاندانی روایات اس کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ وہ سوچتی تھی Ibeon خودداری اور آزادی کی تلقین کرتا ہے۔ کیا اُسے بھول جانا چاہیئے She stoops to conpver سے یہ درس حاصل ہوتا ہے کہ مرد کی محبت حاصل کرنے کے لئے اپنے اونچے درجے سے بھی نیچے اُتر آنا چاہیئے۔ خاندانی معتقدات، خاندانی روایات کا شکست کرنا کس حد تک جائز ہے اور اگر ان روایات کو نظر انداز کر کے ان کو پامال کر کے اپنے عزیز اپنے چہیتوں کا دل خون کر کے زندگی میں مسرت و راحت نصیب نہ ہوئی تو میں جیسے ٹھنڈے پانی کا لہریں مارتا ہوا دریا سمجھ رہی ہوں وہ قریب پہنچنے پر محض ایک سراب ثابت ہوا تو؟ لیکن جان بوجھ کر کنوئیں میں بھی تو نہیں گرا جاتا۔ ہیرے کی کنی جان کے کھائی نہیں جاتی۔ میرے لئے دو راستہ ہیں۔ وہ بغاوت کا راستہ جو سلمہ آزاد و بے پردہ دکھا رہی ہے اور وہ راہ جو اس کے چچا اور اس کی ماں نے اس کے لئے بنائی ہے۔ کیا ساری اور جمپروں کو آگ لگا دوں۔ اپنے تئیں بیچ دوں یا مُنہ پھٹ ہو کے کہدوں کہ میری اُن کے ساتھ بسر نہ ہوگی۔ فقط۔

پانچویں قسط

(از سید امتیاز علی تاج)

(۱۰)

ریحانہ نے صبح کے وقت بلاناغہ باداموں کے ساتھ مکھن اور چینی کھانی شروع کر دی۔ شام کو روغن لبوب سبعہ تعیین سے آدھ گھنٹہ سر میں ڈلواتی۔ رات کو سونے سے پہلے آدھ پاؤ جلیبیاں بالائی کے ساتھ کھاتی۔ پھر بھی اس کا دماغ اس امر کا کوئی قطعی فیصلہ کرنے کے قابل نہ بن سکا کہ وہ اپنی ساریوں اور جمپروں کو آگ لگا کر اپنے کو تج دے یا مُنہ پھٹ ہو کر کہہ دے کہ میری سعید کے ساتھ بسر نہ ہو سکے گی۔

ایک بار اسے یہ خیال ضرور آیا کہ اپنی کل ساریوں اور جمپروں کا آگ کا بیمہ کرڈالنا دوراندیشی سے بعید نہیں ہوگا۔ لیکن پھر یہ سوچا کیا فائدہ اگر اپنے آپ کو تجنے ہی کا فیصلہ کرنا پڑا اور ساری جمپروں کا ساتھ چھوڑنے کے سوا چارہ نظر نہ آیا تو بیمہ کا روپیہ سوائے اس کے کس کام آسکے گا کہ خیرات کر ڈالا جائے۔ ذہنی کشمکش کے اس زمانہ میں ایک روز اُکتا کر اُس نے گراموفون شروع کر دیا جو ریکارڈ ہاتھ میں آتا بغیر دیکھے لگا دیتی۔ مدعا صرف اتنا تھا کہ شوروغل تھوڑی دیر کے لئے دماغ کو اُلجھن سے مخلصی دلادے۔ اتفاق سے ایک ریکارڈ چلا تو اس میں یہ گیت سُنائی دیا۔

"پیسہ پیسہ کی ہے بہار"

نیم غفلت کی سی کیفیت میں اسے موسم بہار کے سرسبز درختوں کی اُلجھی ٹہنیوں میں پیسے ہی پیسے لٹکے ہوئے نظر آنے لگے۔ ایک نامعلوم قوت اس کے نفس کو سرگوشیوں میں کہہ رہی تھی کہ کسی شاخ کو پکڑ کر ہلا اور اپنے اوپر پیسوں کا مینہہ برسالے کہ اتفاق سے ایک پیسہ آپ سے آپ شاخ سے الگ ہوا اور اس کی پیشانی سے لگ کر زمین پر جا پڑا۔ پیسہ کا گرنا تھا کہ یک لخت اُس کی آنکھیں زیادہ کھلنی شروع ہو گئیں۔ اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ ایک بے اختیاری میں سولن حکیم کی طرح اُس کے مُنہ سے نکلا "یا لیا پا لیا" فی الفور گراموفون بند کر کے وہ اُٹھی اور اس الماری کی طرف لپکی جس میں اُس کا نقدی کا بٹوہ رکھا رہتا تھا۔

ریحانہ نے اپنی ذہنی اُلجھن کا کیا حل پا لیا تھا؟ یہ ہم اپنے سامعین کو آگے چل کر مناسب موقع پر بتائیں گے۔ فی الحال اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ حیرت انگیز حل اُسے کبھی نہ سوجھ سکتا تھا۔ اگر اس نے تعلیم مس ڈکر ورا سے نہ پائی ہوتی۔ ان خاتون کی جوانی جب اکارت گذر گئی تو اُنھوں نے اپنے آپ سے عہد کر لیا تھا کہ اب کنواری ہی رہینگی اور اپنی باقی زندگی مشن کا کام کر کے علم تہذیب کی روشنی ہندوستان کو بخشنے میں مصروف کر ڈالیں گی۔ لیکن یہ عہد کرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بدقسمتی سے ان کی ملاقات اس سول سرجن سے ہو گئی جسے مرزا اسد علی بیگ پر فالج کا حملہ ہونے کے بعد الہ آباد سے دارانگر موٹر میں بلایا گیا تھا اور جس کا چہرہ مرزا صاحب کے معائنہ کے بعد اُترا ہوا دیکھنے میں آیا تھا اور جس کی موٹی بھوؤں کی شکنوں نے متعلقین اور ہمدردوں کو بتا دیا تھا کہ وہ کوئی اچھی خبر سنانے کے لئے آمادہ نہیں۔

تھوڑے ہی دنوں میں سول سرجن کی مذکورہ بالا موٹی بھوؤں نے

مس ڈکروزا کا دل بے طرح کھینچ لیا۔ لیکن جب مس ڈکروزا نے محسوس کیا کہ وہ اور سول سرجن اپنی اپنی زندگی کا مشن بہت مختلف قرار دے چکے ہیں تو مس ڈکروزا اپنے دل میں جذبات کی ایک بے پناہ رسہ کشی محسوس کرنے لگیں ایک طرف ہندوستان گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا کہ اے کنواری آ اور مجھ میں علم اور تہذیب کی روشنی پھیلا۔ اور دوسری طرف سول سرجن صاحب سرگوشیوں میں کہہ رہے تھے کہ میری جان ہندوستان میں علم و تہذیب پھیلانے سے پیشتر ہندوستان کو اتحاد اور من تو شدم تو من شدی کا درس دے۔

مس ڈکروزا نے ریحانہ کو بتایا تھا کہ اس زمانہ میں وہ سارا سارا دن رویا کرتی تھی کہ ہندوستان کے لئے زیادہ بہتر اور فائدہ مند مشن فی الحقیقت کونسا ہے؛ آخر ایک رات روتے روتے اُسکی ہچکی بندھ گئی اور اس پر بیہوشی سی طاری ہوگئی اور اس بیہوشی میں خداوند تعالیٰ نے اُس کی رہنمائی کی اور اُسے بشارت ملی کہ اے لڑکی تو خلوص نیت سے ٹاس کرے اور ٹاس کا جو نتیجہ بھی نکلے اس پر استقلال اور استقامت سے عمل پیرا ہو جا تو نجات حاصل کرے گی۔

مس ڈکروزا کا بیان تھا کہ اُنھوں نے اُٹھتے ہی ٹاس کیا اور ٹاس کے فیصلہ پر انہیں آج تک متاسف ہونے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔

تو صاحب اپنی کشمکش ختم کرنے کا یہی ڈھنگ اب ریحانہ کی سمجھ میں آیا۔ اُس نے نقدی کے بٹوے میں سے ایک پیسہ نکالا۔ دیر تک اشک آلود آنکھوں سے اُسے تکتی رہی اور پھر یہ طے کر کے اپنی تقدیر پیسہ کے حوالے کر دی کہ اگر زنجیر آئی تو وہ اپنی ساریوں اور جمپروں کو بغیر بیمہ کرائے آگ لگا کر اپنے آپ کو بیچ دے گی اور اگر سر آیا تو منہ پھٹ ہو کر کہہ دے گی کہ میری سعید کے ساتھ بسر نہ ہو سکے گی۔

یہ کہکر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جذبات طوفان کو دبا کر پیسہ آتی زور سے اُچھالا کہ چھت سے جا لگا۔ وہاں سے پیسہ دہشت خیز قلابازیاں کھاتا اور تقدیر کی طرح رُخ بدلتا ہوا پٹ سے فرش پر آگرا اور لُڑھکتا ہوا ایک کونہ میں جا پڑا۔

ریحانہ پس و پیش سے دُھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ امید و بیم کے عالم میں پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوئی کونے کی طرف بڑھی اور وہاں یہ دیکھکر اسکے منہ سے ایک دبی سی چیخ نکل گئی کہ پیسہ پر تقدیر نے زنجیر کی طرف اوپر کو رکھی ہے ساریوں اور جمپروں کو آگ لگا کر اپنے آپ کو بیچ دینے والی طرف ہئی۔ ہئی۔ ریحانہ بیچاری نے پہلے پیسہ اُٹھایا اور سینت کر بٹوہ میں رکھا اور پھر بستر پر اوندھی گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

باورچیخانہ میں اس کی ماں نجمہ مربہ کا بوہام نصیبن سے منگا کر شام کی چاء کیلئے تمریل میں رکھ رہی تھی۔ لیکن اُسے مطلق خبر نہ تھی کہ اندر اُسکی نور نظر ریحانہ پر کیا گذر رہی ہے۔ لیکن ریحانہ تھوڑی دیر بعد اپنے آنسو پونچھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس کے چہرہ پر ایک عزم برس رہا تھا۔ ایک آہنی عزم۔ وہ عزم جو دشواریوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جو عازم کو نتائج سے بے پروا کر کے راہ مستقیم پر لے جاتا ہے۔ اس نے حوصلہ سے سر اُٹھایا ہمت سے قدم بڑھائے اور پیسہ بٹوہ میں سے نکال کر بولی "میں پھر ٹاس کروں گی"۔

افسوس اس مرتبہ بھی ٹاس نے تقدیر کا سابق فیصلہ بحال رکھا۔ لیکن ریحانہ کم ہمت لڑکیوں میں سے نہ تھی۔ اس نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور بیحد حوصلہ اور استقلال سے کام لے کر اسوقت تک برابر ٹاس پر ٹاس کرتی رہی۔ جب تک کہ تقدیر مجبور نہ ہو گئی کہ پیسہ کی سر والی طرف اوپر لائے۔ اس کے بعد ریحانہ نے فرط مسرت سے پیسہ مونو کل کی طرح آنکھ کے حلقہ میں اٹکا لیا اور

اطمینان کا ایک لمبا سانس لے کر وہی لباس زیب بر کیا جو سعید سے پہلی ملاقات کے موقع پر استعمال کیا تھا۔ موزوں پر جوتا بھی وہی پہنا جس میں سوائے دو چار تسموں کے کوئی چیز پاؤں کی جلد کے رنگ کو چھپانے والی نہ تھی اس طرح تیار ہو کر اس نے سواری منگائی اور ناشتہ پر بڑی لجاجت سے ماں سے اجازت مانگی کہ اُسے سلمہ کے یہاں ہو آنے دیا جائے۔ لیکن جب ماں نے بڑی سختی سے اجازت دینے سے انکار کیا اور اُسے روک دیا تو وہ اک آہ سرد بھر کر ناشتہ کئے بغیر دستر خوان پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ماں سے بحث یا تکرار ادب کے خلاف معلوم ہوئی۔ چنانچہ برقعہ پہن کر چپ چاپ سلمہ کے یہاں چل دی۔ ماں نے کہا کہ "بڑی جا بیں یہ ظاہر ہی نہیں کرنے کی کہ میں نے تجھے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

(۱۱)

ریحانہ پہنچی تو سلمہ کی ماں مسعود کو ساتھ لے کر مصنوعی دانت لگوانے بازار گئی ہوئی تھی۔ احمد علی صاحب صبح کے لئے اٹک کورٹ میں مقدمات کو سر سبز کر رہے تھے گھر والوں میں سے سلما اور محمود کے سوا اور کوئی گھر پر نہ تھا۔ کالج میں تعلیم پانے کے سبب دونوں بہن بھائی چپ چاپ اور متفکر چہروں سے خدا جانے کس خیال میں غرق بیٹھے تھے۔ ایک کنواری لڑکی کی اطلاع سُنکر محمود کا چہرہ فرطِ حیا سے گلابی ہو گیا اور وہ اپنی جبیں سے پسینہ پونچھتے ہوئے باہر جانے لگا۔ لیکن ریحانہ برقع اوڑھے صحن میں داخل ہو چکی تھی۔ محمود کو دیکھا تو شل کا قد آدم مجسمہ بن کر رہ گئی۔ ریحانہ کا برقعہ کسیقدر اونچا تھا۔ اس کے نیچے سے پاؤں نظر آرہے تھے۔ ریحانہ بیچاری کو خبر بھی نہ ہوئی اور محمود کی کنکھیوں نے اُس کے پیروں کو چُپکے سے دیکھ لیا ان پیروں کو جن پر، موزوں پر جوتہ بھی وہ تھا کہ جس میں سوائے دو چار

تسموں کے کوئی چیز پاؤں کی جلد کے رنگ کو چھپانے والی نہ تھی۔ یک لخت محمود کا دل دھڑک کر اس سے کہنے لگا۔ ایسے جوتے اور ان میں موزے تو سلمہ پہنتی تھی۔ یہ لڑکی ضرور عام جدید لڑکیوں سے بجد مختلف ہے اور یقیناً ایک جدا شخصیت کی مالک ہے۔

یہ سوچتا ہوا اور ریحانہ کا چہرہ دیکھنے کی آرزو اپنے دھڑکتے ہوئے دل میں لئے وہ باہر نکل گیا۔ کمرے میں ریحانہ کے داخل ہوتے ہی پہلے باب کے مطابق سلمہ نے پہلے اُسے گدگدایا اور پھر کہا "معاف کرنا محمود بھائی کی تم سے ٹکر ہو گئی۔ مگر سچ پوچھو تو مجھے قلق اس بات کا ہے کہ اُنھوں نے تمھیں برقعہ میں دیکھا۔ میرا مطلب ہے کہ تمھیں برقعہ میں نہیں دیکھا گویا دیکھا تو مگر برقعہ اوڑھے ہوئے دیکھا۔ یعنی برقعہ اوڑھے ہوئے نہیں بلکہ تمھیں دیکھا برقعہ اوڑھے ہوئے یعنی تب دیکھا جب کہ برقعہ تم نے اوڑھ رکھا تھا، تب نہ دیکھا جب تم نے برقعہ نہ اوڑھ رکھا تھا۔ سمجھ گئی نا میرا مطلب"

ریحانہ نے دروازے میں سے صحن کی طرف جھانک کر اس خلا کو دیکھا جو محمود کے باہر جانے سے پیدا ہو گیا تھا اور پوچھا "آپ کے یہی بھائی ہیں۔ جو کھیل میں اوّل تعلیم میں اوّل۔ ادب کا پاکیزہ ذوق۔ شاعری کا مذاق رکھتے اور عورت کو تختِ احترام پر بٹھانا چاہتے ہیں؟"

سلمہ نے ریحانہ کو اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا اور اُس کے کان میں کہا "ہاں ان میں ایک قصّہ کا ہیرو بننے کی ساری خوبیاں موجود ہیں"

ریحانہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے "کاش میں بھی کسی قصّہ کی ہیروئین بن سکتی!"

سلمہ نے اُسے حیرانی سے دیکھا "ارے تمھیں معلوم نہیں کہ تم ہو"

ریحانہ اپنے آنسوؤں کو بھول گئی۔ "سچ مچ"

سلمہ نے کہا: "اور کیا تم نے بڑوں کی اطاعت اور فرمانبرداری کے درمیان خطِ فاصل کھینچ رکھا ہے یا نہیں؟"

ریحانہ سر ہلا کر کہا۔ "ہاں"

سلمہ نے پوچھا: "تم یہ بھی جانتی ہو کہ انسان دُنیا میں بدتمیزی پھیلانے اور بدتمیزی کی زندگی بسر کرنے نہیں آیا؟"

ریحانہ اشتیاق سے بولی: "ہاں"۔

سلمہ نے کہا: "ایک مرتبہ تمھیں مسکراتا دیکھ کر تمہارے شوہر یہ سمجھے تھے کہ تمھاری مُسکراہٹ اس قسم کی ہے جو چوہیا کو پنجے کے نیچے دیکھ کر بلی کے چہرہ پر ہو جاتی ہے؟"

ریحانہ۔ جواب میں فخر سے مسکرا پڑی۔

سلمہ بولی: "اوٹ کے پیچھے کمرہ کا فرنیچر جھاڑنے کے لئے جو ڈسٹر میز کی دراز میں دھلا ہوا رکھا تھا۔ وہ تم نے ایک روز اپنے شوہر کو جوتے پونچھنے کے لئے پیش کیا تھا؟"

ریحانہ کو یاد آ گیا کہ اس موقع پر سعید پسینہ پسینہ ہو گئے تھے۔

سلمہ نے پوچھا: "ایک مرتبہ تم نہیں تھیں تو تمہارا شوہر یوں سرپٹ بھاگا تھا جس طرح بھڑ کا ہوا عرب جانور اتنا تیز جتنا کہ کمان سے چھوٹا ہوا تیر اور اتنا بدحواس جتنا میدان جنگ سے بھاگا ہوا لٹیرا؟"

ریحانہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "یاد تو پڑتا ہے"۔

سلمہ بولی: "بہت خوب علاوہ ازیں تم نے شوہر کے متعلق کبھی اپنے سے یہ سوال کیا تھا کہ اس ہیئت کذائی کو دل میں جگہ دینا کیونکر ممکن ہو گا۔ جو شادی کا

مقصد پورا ہونے کے لئے ضروری ہوتا ہے؟"

ریحانہ سہم کر بولی "کیا تو تھا"۔

سلمہ نے پوچھا: "جب تمھارا خیال سعید کو خلوت میں سامنے کر دیتا تھا۔ تو یہ ایک ایسی تصویر ہوتی تھی، جسے تمہارا احساس سہار نہ سکتا تھا؟"

ریحانہ کی ایک تیز چیخ نکل گئی اور وہ بولی: "ہوتی تھی، ہوتی تھی"۔

سلمہ نے پھر سوال کیا: "تمھیں کبھی یہ خیال آیا کہ تم میرے بھائی کے ساتھ مل کر اپنی زندگی کو گُل پاش اور گُل ریز کرو؟"

ریحانہ کا رنگ فق ہو گیا، نظریں جھک گئیں اور بولی: "آیا تو ہے"۔

سلمہ اُچھل کر کھڑی ہو گئی: "تو بس میری پیاری تم صرف ہیروئن ہی نہیں بلکہ فرنچ ہیروئن ہو۔"

ریحانہ کو معلوم نہ تھا کہ فرنچ ہیروئن سے سلمہ کی مُراد کیا ہے۔ مگر اُسے فرنچ ٹوسٹ بہت مرغوب تھے اس لئے وہ سمجھی کہ ہیروئن کی فرنچ قسم بھی ضرور زیادہ شیریں اور زیادہ لذیذ ہوتی ہوگی۔ چنانچہ خوشی کے مارے اُچک کر وہ سلمہ سے لپٹ گئی۔ پھر اس نے سلمہ کو کھینچ کر اپنے برابر صوفے پر بٹھا لیا اور سرگوشیوں میں بہت اہم بات دیر تک اُس سے کہتی رہی جسے چونکہ ہم سُن نہیں سکے۔ اس لئے اپنے سامعین کو سُنانے سے بھی معذور ہیں۔ لیکن اُسے سُن کر سلمہ بار بار چونکتی اور سر پیچھے کرتی تاکہ ریحانہ کو اپنے چہرہ اور اپنی آنکھوں کا شگفتہ تحیّر واضح طور پر دکھا سکے۔ پھر فی الفور چہرہ پر متانت اور توجہ پیدا کر کے انہماک سے کان اُس کی سرگوشیوں پر لگا دیتی۔ ریحانہ کی ساری بات سُن کر سلمہ ایک گہرے سوچ میں ڈوب گئی، اور دیر تک چُپ چاپ ڈوبی رہی پھر سر اُٹھا کر بولی: "اچھی بات سینما چلی چلتی ہوں، مگر میرے ٹکٹ کے دام تم کو خرچ کرنے ہوں گے"۔

دفورِ مسرت سے ریحانہ نے سلمہ کا مُنہ چوم لیا۔ سلمہ ڈریسنگ روم میں جاکر تیار ہونے کے خیال سے کپڑے اُتارنے لگی۔

(۱۲)

اب ہم اپنے سامعین کو مرزا سعید بیگ کی خدمت میں لے چلتے ہیں۔ اُنہیں ہم سے شکایت ہوگئی کہ ہم نے اب تک اُن کی طرف توجہ نہیں کی۔ ایک ذہنی مباحثہ اور کشمکش کے بعد جب اُنھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے لباس اور اپنی وضع میں مناسب ترمیم کریں گے یعنی جب پیرزادہ غلام صابر صاحب کے عمل نے جو وہ ریحانہ کی تسخیر کے لئے پڑھ رہے تھے۔ اُنٹی سیفی کا کام کر لیا تو اُنہوں نے سوچنا شروع کیا کہ بھائی کیا کرنا چاہیئے۔

ایک روز نمازِ مغرب کے بعد سعید بیگ صاحب نے دل کڑا کیا اپنے چہرہ کے گرد صافہ کا شملہ ڈال لیا اور چھپتے چھپاتے اور واقفوں اور شناساؤں سے نظر بچاتے چھاؤنی بازار میں ایک کباڑی کی دُکان پر جا پہنچے جس کے یہاں مرحوم گورا سپاہیوں کے لباس برائے فروخت کھونٹیوں پہ ٹنگے رہتے تھے۔ یہاں سے اُنھوں نے ڈسٹ گرے رنگ کا ایک گرم سوٹ۔ ایک فل بوٹ کا جوڑا ایک خاکی سولہ ہیٹ اور ایک نیلا اوورکوٹ خرید لیا۔ چوروں کی طرح جلدی جلدی ان چیزوں کی گٹھری اپنے کندھے کے رومال میں باندھی۔ اور بگٹٹ گھر روانہ ہوگئے۔

باب اوّل میں بتایا جا چکا ہے کہ اُن کو بہ نسبت شہر کے جنگل اور بہ نسبت آدمیوں کے جانوروں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ چنانچہ اگلے روز نمازِ فجر سے فارغ ہوکر کپڑوں کی پوٹلی بغل میں دبائی اور اندھیرے مُنہ سے

نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی

نکل گھر سے راہ اس نے جنگل کی لی

وہاں ایک شکستہ اور ویران مقبرہ میں پہونچکر اُنھوں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ حواس بجا ہونے کے بعد مقبرہ کے اِرد گرد پھر کر دیکھا کہ حُسنِ اتفاق وہاں کسی اور کو تو نہیں لے آیا۔ قبر پر نظر ڈال کر اطمینان کیا کہ وہ مُردہ بدستور قبر کے اندر ہے اس کے بعد جلدی اپنے کپڑے اُتار ڈالے اور بوٹ سوٹ اور اوورکوٹ پہن لیا۔ سر پہ ہیٹ لگالی اور اس نئے ملبوس سے اپنے آپ کو مانوس کرنے کے لئے جنگل کی خلوت میں تشریف لے گئے۔ وہ متواتر کئی روز اسی عمل میں مصروف رہے۔ یہ عمل ایک پُر اسرار اور ناقابلِ فہم طریق سے اُن کی ڈاڑھی پر بھی اثر انداز ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ ہر صبح جب وہ اپنے مقبرہ والے ڈریسنگ روم میں تشریف لے جاتے تو اُن کی ڈاڑھی بمقابلہ سابق دن کے ہمیشہ ایک اُنگل کم ہو چکی ہوتی تھی۔ ایک زوال پذیر ڈاڑھی کے ساتھ وہ سوٹ اور اوورکوٹ پہنے ہیٹ لگائے ریحانہ کی یاد دل میں بسائے چُپ چاپ شیشم اور دیودار کے جنگلوں میں چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ بعض بن باسیوں نے ان سے پُوچھا تھا جب اس جنگلوں کو یہ کر کٹوانا اور شہر میں لکڑیوں کی ٹال کُھلوانا چاہتا ہے کیا؟“ جواب میں سعید کی زبان سے بے اختیار نکلا ”ہای یو ڈیم فول“۔ یہ جواب دے کر سعید نے ایک عجیب سرور محسوس کیا اور اس کے اندر ایک خود اعتمادی پیدا ہو چلی۔

یہ لباس اندرونی ارتفاع کا جو اثر ڈال رہا تھا اس سے سعید میاں کا حوصلہ بڑھا اور اب رفتہ رفتہ اُنھوں نے جنگل کے اندر سے نکل کر جنگل کے کنارے کنارے گھومنا شروع کر دیا۔ انسانوں سے زیادہ جانوروں سے دلچسپی تھی۔ وہاں سے کوئی بندر والا گزرتا تو اس سے بندر کا تماشہ دیکھ لیتے۔ ریچھ والا گزرتا تو ریچھ کے ناچ سے لُطف اندوز ہو جاتے، تماشہ کرنے والوں سے بات ہمیشہ

انگریزی میں کیا کرتے تھے۔ لہٰذا انگریزی کے جتنے الفاظ سُننے کے بعد کہیں دماغ میں اٹکے رہ گئے تھے۔ اُن سے زبان کے مراسم رفتہ رفتہ بڑھنے شروع ہو گئے تھے۔ بتدریج سعید صاحب کو اتنا حوصلہ بھی ہو گیا کہ کوٹ پہن کر شہر کے قریب آ جاتے۔ جس روز ریحانہ اور سلمہ سینما گئیں۔ اُسی روز سعید صاحب گشت کرتے ہوئے شہر تک آئے۔ اتفاق سے ایک دیوار پر سینما کا اشتہار نظر پڑ گیا۔ "ٹریڈر ہارن" جنگل اور جانوروں کا بے نظیر فلم۔ آخری روز "آپ جانئے جنگل اور جانوروں کے الفاظ میں سعید کے لئے ایسی بے پناہ کشش تھی کہ اشتہار کو دیکھا تو اُس پر سے نظر میں نہ اُٹھائی گئیں۔ طبیعت لوٹ پوٹ ہو گئی۔ جی بے اختیار چاہنے لگا کہ اس فلم کے آخری تماشے سے لطف اندوز ہو لیں، مگر تماشے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ سوٹ پہنے ہوئے شہر کے اندر گھسنا سینما میں جانا۔ تماشائیوں کے ہجوم میں بیٹھنا۔ دل کتنا تھا تو جا میں نہیں جانے کا اور سعید کہہ رہے تھے بے شک اگر جنگل اور جانور ہیں تو "بچ کھیت جاؤنگا" طرح طرح کے اندیشوں اور تفکرات نے دماغ میں ایک ہڑبونگ سی مچا رکھی تھی۔ لیکن اس دماغی ہڑبونگ میں وہ بعض اس قسم کے محاورے بھی سُن رہے تھے کہ "جب اوکھلی میں سر دیا تو موسل کا کیا ڈر" "گڑ کھاؤں اور گلگلوں سے پرہیز" "جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس"۔ اور پھر جانتے تھے کہ یہ لباس اختیار کیا ہے تو آخر ایک روز آئے گا، جب اُسے پہن کر دُنیا کے سامنے جانا ہوگا۔ چنانچہ دل کڑا کیا اور احتیاطاً ٹوپ ذرا سامنے کو جھکا لیا اور کوٹ کا کالر اوپر کو اُٹھا دیا جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور گُستھ باستھ کرتے دار انگر کے اُسی سینما کو چل دیئے جس میں آج ریحانہ اور سلمہ گئی ہوئی تھیں۔ فقط

چھٹی قسط

(از خان بہادر حکیم احمد شجاع)

مرزا سعید بیگ اس ہیئت کذائی میں سینما کے ٹکٹ گھر تک بمشکل پہنچ سکے۔ ایک تو اُس دن "جنگل اور جانوروں کی بے نظیر فلم ٹریڈر ہارن" کی وجہ سے سینما کے باہر بہت بھیڑ تھی۔ دوسرے جو شخص بھی مرزا سعید بیگ کو دیکھتا۔ بس اُن کو دیکھتا ہی چلا جاتا۔

ایک اچھا خاصا آدمی اور وہ انواع واقسام کے گورا سپاہیوں کا پُرانا فوجی لباس زیب تن کئے ہوئے۔ لوگوں کو حیرت نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا! اس لباس کو منتخب کرنے میں مرزا صاحب نے جس بصیرت سے کام لیا تھا وہ واقعی قابل داد تھی۔ بوٹ تو اُنھوں نے کیولری کے کسی گھڑسوار کا خریدا تھا۔ اور پتلون کسی نیول افسر کی۔ معمولی کوٹ کی جگہ اُنھوں نے میس کی ڈنر جیکٹ پسند فرمائی تھی اور اوور کوٹ کسی خچر بازی رجمنٹ کے افسر کا۔ سولا ہیٹ اپنی جغرافیائی حدود کے لحاظ سے کسی مرحوم و مغفور Garrison Engineer کی دکھائی دیتی تھی اس پر اُن کی گھنی ڈاڑھی اور موٹی توند۔ مرزا جی اس لباس میں اچھے خاصے Admiral Nelson کے وقت کے کوئی نیول کمانڈر معلوم ہوتے تھے۔

مرزا صاحب سینما کے دروازے میں داخل ہوتے ہی تماشائیوں کے ایک جم غفیر میں گھر گئے۔ لیکن اُنھوں نے اس ہجوم اور لوگوں کے شور و غوغا کو اپنی تخفیت اور اپنے لباس کے تحسین انتخاب کے حق میں ایک خراجِ تحسین تصور کیا اور کسی بڑے بھاری

ہو کر لیڈر کی طرح اس جم غفیر میں گھرے گھرائے لوگوں کے شور و غل کا جواب ایک خفیف سی مسکراہٹ اور گردن کی جنبش سے دیتے ہوئے ٹکٹ گھر کی طرف بڑھتے چلے گئے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے رُک کر اُنھوں نے تماشے کے ٹکٹ کی شرح کا کچھ اس طرح مطالعہ شروع کیا جیسے کوئی بہت بڑا منجم اجرام فلکی کی گردش اور ستاروں کی رفتار کا حساب لگا رہا ہے۔ ٹکٹ کی شرح چار آنے سے لے کر تین روپے تک تھی مگر چار آنے سے اوپر کے تمام درجوں پر دو آنے فی روپیہ کے حساب سے ٹیکس کی ادائے گی لازمی تھی۔ بہت ہی غور و خوض کے بعد مرزا صاحب اس نتیجہ پر پہونچے کہ سنیما والوں کو اختیار ہے کہ ٹکٹ کی قیمت جس قدر چاہیں مقرر کریں۔ لیکن کسی حکومت کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ انسان کی ذاتی مسرتوں پر ٹیکس عائد کرے۔ اس لئے کسی ایسے درجہ کا ٹکٹ خریدنا جس پر Entertainment ٹیکس ادا کرنا پڑے۔ ایک اصولی غلطی اور اخلاقی جرم ہے۔ بس اُنھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ چار آنے کا ٹکٹ خریدیں گے اس تمام منطق کے پس پردہ مرزا صاحب کی طبیعت کی خست اور اُن کی فطرت کی پستی تھی ورنہ کہاں ٹیکس جیسا مشکل مسئلہ اور کہاں مرزا صاحب کا مبلغ علم۔ آخر کار اُنھوں نے اپنی جیب سے ایک میلا سا بٹوہ نکالا اور اس میں سے بڑی چھان بین کے بعد ایک چونی تلاش کی اور ٹکٹ خریدنے کے لئے آگے بڑھے اس چونی کو اُنھوں نے ٹکٹ گھر کے بابو کے سامنے اس زور سے پھینکا اور پھر اس رعب و داب سے ٹکٹ طلب کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سارے کا سارا سنیما ہال ریزرو کرا رہے ہیں۔

غرض ٹکٹ لے کر وہ دار النگر کے آوارہ لڑکوں اور اوباش نوجوانوں کے ہجوم میں بچتے بچاتے چار آنے کے درجے کے دروازے تک جا پہنچے اور پھر دروازے کا پردہ ہٹا کر وہ سنیما ہال میں کچھ اس شان سے داخل ہوئے، جیسے کوئی

عظیم الشان فاتح اپنے فتح کئے ہوئے شہر کے دروازے کے اندر داخل ہوتا ہے۔

جب مرزا جی سنیما ہال میں پہونچے تو ایک ہڑبونگ مچ گیا لوگ سمجھے کہ سینما کے مالکوں نے اپنے تماشے کی پبلسٹی کا یہ کوئی نیا طریقہ نکالا ہے اور اس مرد شخص کو تماشے کے کسی کیریکٹر کا لباس پہنا کر سرکس کے جوکروں کی طرح اُن کا دل بہلانے کے لئے سینما ہال میں بھیج دیا ہے۔ مرزا صاحب حیران تھے کہ آج اُن میں اتنی دل کشی کیوں پیدا ہو گئی ہے۔ یہ لوگ تو اُنھیں ہر روز دیکھتے تھے۔ مگر آج تک کوئی ان کی طرف متوجہ نہ ہوا تھا۔ سوچنے لگے کہ ہو نہ ہو یہ ساری برکت انگریزی لباس کی ہے۔ اُنھوں نے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ کل صبح ہی وہ پھر اس کباڑی کی دُکان پر جائیں گے اور ایک اس سے بھی زیادہ قیمتی لباس خریدیں گے۔ غرض مرزا صاحب بڑی سج دھج سے اس طرح وہ گورا شاہی اوور کوٹ پہنے اور وہ Garrison Engineer کا سولا ہیٹ لگائے سب سے آگے کی صف میں بیٹھ گئے۔ ہاں وہ اس بات پر ضرور حیران ہو رہے تھے کہ پڑھے لکھے انسان بھی اتنے بیوقوف ہو سکتے ہیں کہ تین روپے کا ٹکٹ خرید کر ساری دُنیا سے پیچھے بیٹھیں وہ کوشش کر رہے تھے کہ اس بات کو اپنی عقلمندی کی دلیل سمجھیں کہ اُنہوں نے چار آنے کا ٹکٹ خریدا اور سب سے آگے بیٹھے۔

اب تماشہ شروع ہوا۔ اُنھوں نے سنیما کے پردے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ جنگل اور جانوروں سے مرزا صاحب کو شہر اور آدمیوں کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی تھی اس لئے جنگل اور جانوروں کو پردۂ فلم پر اپنے سے بہت ہی قریب پا کر وہ بالکل At Home ہو گئے۔ مرزا سعید بیگ جنگل اور جانوروں کے اس تماشے کو دیکھنے میں ایسے محو ہوئے کہ ان کی ٹانگیں خود بخود پھیلنے لگیں اور راحت و اطمینان کے لمبے لمبے سانسوں سے ان کی توند پھولنے لگی۔ ان کا سر ان کے سولا ہیٹ کے زیر سایہ بنچ کے پشتی بان کا سہارا لے کر

جمناسٹک کے کرتب کرنے لگا۔ سینما کے پردہ پر ایک شیر کو ایک گھنے جنگل سے نکلتے ہوئے دیکھکر وہ اس قدر خوش اور مطمئن ہوئے کہ ان کی قوت ہاضمہ پہلے سے زیادہ تیزی سے کام کرنے لگی اور اس نے اپنی استعداد کا Certificate ایک عدد ڈکار کی شکل میں پیش کرنا چاہا۔ اتنے میں شیر نے دہاڑنا شروع کیا، مرزا صاحب شیر کی یہ بے تکلفی دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے بھی اس زور و شور سے ڈکار لی کہ ان کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تماشائی یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ سینما کا شیر دہاڑ رہا ہے یا مرزا جی ڈکار رہے ہیں۔

اتنے میں جنگل کے گنجان درختوں میں سے ایک ہاتھی نکلا اور اس نے چنگھاڑنا شروع کیا۔ مرزا صاحب نے بھی جواباً ان جانوروں کے ساتھ زیادہ بے تکلف ہو چکے تھے ایک جمائی لی اور جمائی کے ساتھ انگڑائی بھی ان کے بدن کی اس عصبی کشاکش کے ساتھ ساتھ خدا جانے ان کے دل میں کیا سمائی کہ انھوں نے بھی اس ہاتھی کی طرح چنگھاڑنا شروع کر دیا۔ سب تماشائی ہنسنے لگے۔

مرزا جی اپنے اس کمال پر بہت ہی نازاں ہوئے اور خود بھی ہنسنے لگے۔ یہ ہنسی ایک متعدی مرض کی طرح سینما ہال میں پھیل گئی۔ ریحانہ اور سلمہ سینما ہال کے بکس میں بیٹھی تھیں۔ وہ بار بار یہ شور سنکر حیران ہو رہی تھیں اور اس بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ آخر یہ کیا بات ہے کہ چار آنے کے درجے میں ہر دس منٹ کے بعد ایک شور و غوغا برپا ہو جاتا ہے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ ان تمام دلچسپیوں کا مرکز ریحانہ کے شرعی شوہر مرزا سعید بیگ ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے تماشہ ختم ہوا اور سب لوگ سینما ہال سے باہر نکلے۔ سلمہ نے ریحانہ سے کہا کہ "تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ بہن اس بھیڑ کو چھٹ جانے دو۔ برقعہ پوش عورتوں کو دیکھکر لوگ طرح طرح کے آوازے کستے ہیں"۔

غرض تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد ریحانہ اور سلمہ بھی ہال سے باہر نکلیں۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گئیں کہ جن لوگوں سے سینما ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا وہ سب کے سب سینما ہال کے دروازے پر جمع ہیں اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ اتنے میں انھوں نے دیکھا کہ پولیس کے سپاہیوں نے ایک عجیب و غریب وضع کے انسان کو پکڑ لیا ہے اور وہ اس کے ارد گرد گھیرا ڈالے اسے سینما ہال کے اندر لا رہے ہیں۔ ریحانہ اور سلمہ نے بھی آگے بڑھ کر اس دلچسپ شخص کو دیکھنے کی کوشش کی۔ مرزا سعید کو پہچان کر ریحانہ کی چیخ نکل گئی۔ سلمہ نے پوچھا "کیوں خیر تو ہے؟"

ریحانہ نے اپنے غصہ کو دباتے ہوئے کہا کہ "یہی تو ہیں میرے شوہر مرزا سعید بیگ"۔

سلمہ چپ ہو گئی۔ ریحانہ کو سلمہ اپنے ہی مکان پر لے آئی اور کوشش کرنے لگی کہ کسی طرح اس کا دل بہلائے۔ مگر ریحانہ کے دل کی اس وقت کچھ اور ہی کیفیت تھی۔ اس کی آخری امید کی شمع بجھ چکی تھی۔ اسکی آنکھوں سے غلط فہمی کا آخری پردہ ہٹ چکا تھا اسکے دماغ پہ ایک نہایت تلخ حقیقت اپنی پوری شدت کے ساتھ روشن ہو چکی تھی۔ اب تک اس کو امید تھی کہ مرزا سعید بیگ اپنی وضع قطع اپنے طور طریقے بدل دینے کے بعد اس قدر غیر مہذب اور ناخوشگوار انسان نہ رہیں گے۔ مگر آج اس نے دیکھ لیا کہ کیکر کے ایک کندۂ ناتراش پر روغن کیا جا سکتا ہے۔ اس کو آبنوس یا ہاتھی دانت نہیں بنایا جا سکتا آج اسکو معلوم ہو گیا کہ اسے مرزا سعید بیگ کے لباس سے اتنی نفرت نہ تھی جتنی نفرت اس کو ان کی فطرت سے تھی۔ اس کو ان کے مذہبی مشاغل سے اتنی نفرت نہ تھی جتنی نفرت اس کو ان کی بدتہذیبی سے تھی۔ اس کو ان کے میلے رومال ان کے کھول کے سے عمامے ان کی موٹی توند اور ان کے مٹی سے اٹے ہوئے جوتوں سے

اتنی نفرت نہ تھی۔ جتنی نفرت اُسے ان کے سڑے ہوئے دماغ۔ ان کے گندے دل اور اُنکے غلاظت سے اُٹے ہوئے رُجحانات سے تھی۔

وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح چلّا اُٹھی "تو کیا سلمہ مجھے اپنی ساری زندگی اس حیوان کے ساتھ گذارنی ہوگی۔ زندگی جیسی قیمتی چیز کو اس غول بیابانی کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھانا ہوگا۔ کیا کوئی ایسی طاقت نہیں جو مجھے اس زندہ لعنت سے چھڑاسکے کیا شادی کی یہی برکتیں ہیں کہ اس کا ایک لفظ میری زندگی کی ہزاروں ساعتوں کو زہر کی طرح اُداس اور مہیب بنادے؟"

سلمہ کے والد احمد علی صاحب ساتھ ہی کے کمرے میں کھانا کھارہے تھے۔ اُنھوں نے ریحانہ کی بیتابی سے بھری ہوئی فریاد سُنی تو گھبرا گئے۔ بہت سی باتوں کا ان کو پہلے ہی سے علم تھا اب ریحانہ کے ان زہر میں بُجھے ہوئے فقروں کو سُنا تو سب کچھ سمجھ گئے۔ فوراً ہاتھ دھو کر سلمہ کے کمرے میں آئے۔ ریحانہ کو وہ بیٹی کی طرح سمجھتے تھے۔ ریحانہ کو ان سے کوئی پردہ نہ تھا۔ وکیل صاحب نے دیکھا کہ ریحانہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اور وہ ایک گھائل چڑیا کی طرح تڑپ رہی ہے۔

اُنھوں نے ریحانہ کو دلاسا دینے کی کوشش شروع کی مگر اس کوشش میں ان کی اپنی آنکھوں سے آنسوں جاری ہوگئے پھر ذرا سنبھل کر بولے "بیٹی مذہب میں بہت برکتیں ہیں۔ مگر ہم مذہب کی برکتوں سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ ہم خود اپنے آپ کو سماج کی لعنتوں میں گرفتار کرتے ہیں، اور مذہب کو بُرا کہتے ہیں۔ میں تمہاری مصیبتوں سے واقف ہوں۔ میں تمہارے دُکھ کو جانتا ہوں۔ میں نے تمہارے مرحوم ماموں کو کتنا سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے۔ میں نے اس کے بعد تمھیں ان مصیبتوں سے نجات دلانیکی کوشش کرنی چاہی مگر اپنے اندر جرأت نہ پائی۔ میں تمھاری ماں کی ضد سے جسے وہ شرافت کے نام سے پکارتی ہیں۔ خوب واقف ہوں میں تمھاری

ماں کی قدامت پرستی کو جسے وہ خاندانی وضعداری کہکر پکارتی ہیں۔ خوب پہچانتا ہوں لیکن اب تم کو یوں تڑپتا دیکھ کر۔ ایک معصوم لڑکی کو یوں بلکتا دیکھ کر مجھ سے صبر نہ ہوسکے گا۔ مذہب کے دُکھوں کا علاج مذہب ہی کے پاس ہے، مذہب کی پابندیوں سے مذہب ہی آزاد کرسکتا ہے۔ مذہب کے نام پر کئے ہوئے مظالم کا انصاف اگر کوئی طاقت کرسکتی ہے تو وہ مذہب ہی کی طاقت ہے۔

سُنو اسلام نے عورت کو بہت بڑے حقوق عطا کئے ہیں۔ معاشرتی زندگی میں اسلام نے عورت کو مرد کے برابر کردیا ہے، پھر اگر تم خود مردوں کو اس بات کی اجازت دو کہ وہ اپنے حقوق کا ناجائز فائدہ اُٹھائیں............ اور عورتوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کردیں تو اس اسلام کا کیا قصور ہے۔ مذہب کا کیا قصور ہے۔

سُنو اسلامی قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کوئی لڑکی جس کا نکاح اس کے بالغ ہونے سے پہلے اس کے والد یا کسی دوسرے ولی نے اپنی مرضی سے کردیا ہو وہ بالغ ہونے پر اس نکاح کو اپنی مرضی سے فسخ کرسکتی ہے خواہ وہ اس عرصہ میں خاوند کے گھر آباد بھی رہ چکی ہو۔ خواہ وہ بچوں کی ماں بھی بن چکی ہو۔ اس کے علاوہ اسلامی قانونِ ازدواج تمھارے اور مرزا سعید بیگ کے نباہ میں بہت سے مکروہ اختلافات حائل پاتا ہے۔ جن کی بنا پر تم کو خلع کا اختیار ہے۔ ایک نازک شیشہ کو ایک کرخت پتھر کے ساتھ نہیں جوڑ سکتے۔ ریشم کے ایک نرم تاگے کو سن کی رسّی کے ساتھ نہیں بٹ سکتے۔ ٹاٹ کی گدڑی پر زربفت کا پیوند نہیں لگ سکتا۔ ایک انسان کو ایک حیوان کے ساتھ ایک ہی پنجرے میں بند نہیں کیا جاسکتا۔ ریحانہ کو مرزا سعید بیگ کی بیوی بننے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ میں ایک وکیل ہونے کی حیثیت سے قانون کا محافظ ہوں،

تمہارے مرحوم باپ کا دوست ہونے کی حیثیت سے تمہارا ولی اور سرپرست ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے اسلام کے نام پر ایک مسلمان لڑکی پر یہ ظلم نہیں ہوگا۔ میں کل صبح ہی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ اپنی فریادوں سے سوتے ہوئے انصاف کو جگاؤنگا، اگر میں سارے ہندوستان کو مجبور نہ کر سکا کہ وہ عورت ذات کے حقوق کو پہچانے تو نہ سہی۔ مسلمانوں کو ماننا پڑے گا کہ وہ جس قانون کے مطابق نکاح کا عہد باندھتے ہیں اسی قانون کے مطابق اس عہد کو توڑ کیوں نہیں سکتے۔ ریحانہ طلاق ایک مکروہ چیز ہے۔ مگر جب عورت اور مرد کا نباہ نہ ہو سکے تو طلاق ایک برکت ہے ریحانہ۔ ایک رحمت ہے ریحانہ۔ تم کو اس زندہ لعنت سے بچانے کا ایک ہی علاج ہے ریحانہ۔ طلاق!"

جج صاحب کی عدالت تماشائیوں کے ہجوم سے بھری ہوئی تھی۔ احمد علی صاحب وکیل ریحانہ کو ساتھ لئے ریحانہ کے حقِ خلع کو عدالت پر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سامنے مرزا سعید بیگ بھی اپنے وکیلوں کو ساتھ لئے حاضر تھے۔ آج وہ اس عزم صمیم کے مطابق جو انھوں نے اس رات سینما میں اپنے دل سے کیا تھا۔ پہلے سے بھی زیادہ شاندار لباس میں ملبوس تھے۔ انھوں نے پولوں کھیلنے والوں کا لمبا سیاہ جیک بوٹ پہن رکھا تھا۔ جس میں دو تین جگہ مہمیز کے زخموں کے سوراخ تھے چونکہ انھوں نے اس بوٹ کو ایک کباڑی کی دکان سے خریدا تھا۔ اس لئے ایک ہی بوٹ میں مہمیز تھی۔ دوسری مہمیز باوجود کوشش بسیار دستیاب نہ ہو سکی تھی۔ سولا ہیٹ تو وہی تھا مگر اس کی پگڑی میں کسی فوجی افسر کی دیکھا دیکھی کچھ پر لگانے کی کوشش کی گئی تھی۔ چونکہ کسی اور پرندہ کے پر مقدمہ کی پیشی سے پہلے پہلے دستیاب نہ ہو سکتے تھے اس لئے انھوں نے مرے گدھ کے دو چار لمبے لمبے پر اپنے سولا ہیٹ کی پگڑی میں اُڑس لئے تھے۔

آج ان کے بدن پر وہ نیلا اوورکوٹ نہیں تھا۔ بلکہ کسی فوج کے مرحوم بینڈ ماسٹر کا لال اوورکوٹ تھا۔ جس کے سینے پر بے شمار سنہرے بٹن اور سنہرے لیس کے فیتے تھے۔ پتلون چونکہ لیس دار میسر نہ آسکی تھی اس لئے انھوں نے خود ایک پرانی پتلون پر دونوں طرف نئی لیس ٹکوالی تھی ان کے ایک ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک بھاری سی چھتری۔

مرزا سعید بیگ کو کامل یقین تھا کہ ان کو اس شاندار لباس میں دیکھ کر کوئی عدالت بھی ریحانہ کی رخصتی کے مطالبے کو نامنظور نہ کر سکے گی۔ مگر جج صاحب نے احمد علی صاحب وکیل کی بحث کو سننے کے بعد مرزا سعید بیگ سے یہ سوال کیا کہ تم ایک مہذب شریف اور پڑھی لکھی لڑکی کو بیوی بنانے کا کیا حق رکھتے ہو۔ تو مرزا سعید بیگ غصہ اور مایوسی کو ضبط نہ کر سکے۔ کچھ تو اس غصہ اور مایوسی کے اظہار کے لئے اور کچھ اپنے علمی تبحر کے جوش میں ایک دم چیخ کر بولے:۔ "ہاؤ ڈیم فول"

جج صاحب نے سنتے ہی پولیس کانسٹبل کو اشارہ کرتے ہوئے کہا گرفتار کر لو اس بدتمیز کو، اور پھر احمد علی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "میں آپ کی موکلہ کی درخواست پر اس کا نکاح فسخ کرتا ہوں جو اس کے ولی نے آپ کی موکلہ کے سن بلوغ سے پہلے اپنی مرضی سے اپنے بیٹے مرزا سعید بیگ سے کر دیا تھا۔ اور اس کے علاوہ مرزا سعید بیگ کو ہتک عدالت کے جرم میں ایک ماہ قید کی سزا دی جاتی ہے۔"

یہ فیصلہ سنتے ہی مرزا سعید بیگ "ٹریڈ رہارن" کے ببر اور ہاتھی کی طرح دہاڑنے اور چنگھاڑنے لگے۔ ریحانہ نے عدالت کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر مرزا سعید بیگ اس قدر بدتہذیب اور بدتمیز نہ ہوتے تو وہ ان سے علیحدگی پسند نہ کرتی۔ اس لئے عدالت اپنے رحم کو کام میں لاکر ان کی اس بدتمیزی کو

معاف کردے۔

جج صاحب نے ریحانہ کی درخواست پر مرزا سعید بیگ کو معاف کر دیا۔

مرزا سعید بیگ عدالت کے کمرے سے جو نکلے تو بگٹٹ اس ویران مقبرے کی طرف بھاگے۔ جس کو جنگل میں اُنھوں نے اپنا ڈرائینگ روم بنا رکھا تھا۔

اسی شام کو ریحانہ اور سلمہ پھر سینما گئیں مگر آج ان کے ساتھ سلمہ کا بھائی محمود بھی تھا۔ محمود اور ریحانہ کے چہرے پر ایک نئی خوشی کی روشنی ایک نئی امید کی جھلک تھی۔ سینما سے باہر آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ مگر سینما کے اندر ریحانہ اور محمود کی دُنیا میں ایک اُمنگوں اور مسرتوں سے لبریز زندگی کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔

ادھر مرزا سعید بیگ اس ویران مقبرے کی تاریکی میں ایک سنسان قبر کی آغوش میں لیٹے ہوئے پیرزادہ غلام صابر کے بتلائے ہوئے جلالی عمل میں مصروف تھے۔

(سید وصی اشرف چشتی مالک کتب خانہ علم و ادب دہلی نے علیمی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا)

کتب خانہ علم و ادب کی دیگر مطبوعات

ناول

بن باسی دیوی۔ از اشرف صبوحی قیمت .... دو روپے آٹھ آنے
سلمٰی (بغداد کا جوہری) ... ” .... دو روپے
شرابی .... ” زیر طبع
دو شیزہ صحرا ۔ از صادق الخیری ایم۔ اے دہلوی .... قیمت دو روپے
جہاں آرا ۔ از ظفر قریشی بی۔ اے دہلوی ...... قیمت دو روپے آٹھ آنے
نگہت ۔۔۔ از قیسی رام پوری .... قیمت دو روپے آٹھ آنے
بھابی جان ... از فضل حق قریشی دہلوی ...... قیمت دو روپے آٹھ آنے
نادِ دست ...... از شاہد احمد بی۔ اے دہلوی۔ قیمت دو روپے
کھرا بہادر ...... از عظیم بیگ چغتائی .... قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے
ٹوٹے ہوئے پر ..... از خلیل جبران .... زیر طبع
ابن مسلم .... از سلطان حیدر جوش ...... ”
مراۃ العروس .... از مولوی نذیر احمد .... ایک روپیہ آٹھ آنے
بنات النعش .... ” .... ایک روپیہ آٹھ آنے
توبۃ النصوح .... ” .... ایک روپیہ آٹھ آنے
لالہ رُخ ...... ل۔ احمد .... دو روپیہ آٹھ آنے
دردِ جاں ستاں ... حکیم خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی۔ زیر طبع

افسانے

سچی کہانیاں .... از پریم چند بھاری قیمت تین روپے

ستات تارے ...... سات مشہور ادیب ...... قیمت تین روپے
جھروکے .... از اشرف صبوحی ...... زیر طبع
شمع انجمن .... از صادق الخیری ایم۔اے دہلوی۔۔ قیمت دو روپے
سمن پوش .... از مجنوں گورکھپوری ...... قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ
گردش .... " ...... قیمت ایکروپیہ
رقاصہ ...... از ایم اسلم ...... قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے
خطوط کی ستم ظریفی ... عظیم بیگ چغتائی ...... دس آنے ١٠/
دکن کی پری ...... ناصر نذیر فراق دہلوی ...... قیمت چھ آنے ٦/
دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ .... " " چار آنے ٤/
بیگموں کی چھیڑ چھاڑ .... " " چار آنے ٤/
خواب پریشاں .... از مولوی عنایت اللہ بی۔اے دہلوی قیمت چار آنے
ایک کہانی .... چھ مشہور ادیبوں کی زبانی ...... قیمت آٹھ آنے
گمنام عورت کا خط ... از ظفر قریشی بی۔اے دہلوی ...... " چار آنے
عشق کی گولیاں ... از مرزا فرحت بیگ و سلطان حیدر جوش قیمت چار آنے
انکشاف حقیقت .... صادق الخیری ایم۔اے دہلوی ... قیمت چار آنے
تماشہ پر تماشہ ... از ناکارہ حیدرآبادی ...... قیمت چار آنے

سیاست

مسلمانان ہند کی حیات سیاسی۔ از محمد مرزا دہلوی .... قیمت ایکروپیہ آٹھ آنہ
دوسری جنگ عظیم .... " ...... " دو روپے

مزاحیہ

بے پر کی .... از آوارہ .... زیر طبع
کائنات تبسم ...... از شوکت تھانوی .... "

نظم

سلاسل .... از جان نثار اختر .... قیمت ایکروپیہ چار آنے
دیوان حالی ...... از حالی .... " ایکروپیہ آٹھ آنے
گہوارۂ تبسم ...... ظریف دہلوی .... " چار آنے
طوفان ظرافت ...... از سراج الدین احمد دہلوی ...... زیر طبع

تنقید

مقدمہ شعر و شاعری ... از الطاف حسین ...... قیمت ایکروپیہ آٹھ آنہ
افسانہ پدمنی ...... از مولوی احتشام الدین دہلوی ایم۔اے۔ قیمت ایکروپیہ

بچوں کے لئے

زلفی ہر دو حصہ ..... از مولوی عنایت اللہ دہلوی بی۔اے۔ زیر طبع
سات طلاقوں کی کہانیاں ... از ناصر نذیر فراق دہلوی۔ قیمت چار آنے
ترکی شہسوار .... بلقیس بیگم .... " چار آنے
دیوؤں کے ملک میں ...... از اشرف صبوحی .... " زیر طبع
صبا باد شاہزادہ۔ از اشرف صبوحی۔ قیمت تین آنے۔ لعل شہزادہ۔ از اشرف صبوحی ٣/
تھوڑی تارا ناکھتے چاند۔ " ٣/ (مضامین) شہزادہ طلوار۔ " ٣/
مضامین فراق۔ از حکیم خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی۔ قیمت ایکروپیہ
پھول والوں کی سیر۔ از مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی " چھ آنے ٦/